

دکھاوے کا غضرنہ تھا۔ ان کی گفتگو میں ایک عجیب قسم کی مخصوصیت تھی۔ وہ اپنی
غربت کا اظہار کرنے سے گہراتے نہ تھے۔ ایک پیسے کا سودا لینے کو عارضہ سمجھتے تھے۔
دولت پورلاہور سے کس قدر مختلف تھا۔

سلفراور پٹاخہ

دولت پور کی زندگی کا مرکز پنواڑی کی دوکان تھی جو عموم کے جذبات کی عکاسی
کرتی تھی۔ ہر دوکان پر چار ایک نوجوان جمع رہتے جو پان کھاتے۔ ایک دوسرے پر
نقرے کتتے اور پھر سینٹھ گردھاری لال یادن لال بھا بھڑہ کے تازہ ترین معاشے پر
ہنس نہس کر باتیں کر رہتے تھے۔ ایک دوسرے سے ان کی باتیں سختا اور پھر آگے نکل جاتا
اس کے لیے ایسی دوکان پر جانا ممکن نہ تھا۔ جہاں لوگوں کا جگہ ملھا لگا ہو۔ پان
خریدنے کے لئے وہ ایسی دوکان پر جایا کرتا تھا جہاں کوئی گاہک نہ ہو مگر کبھی کبھار
ایسا بھی ہو جاتا کہ سو دا خریدنے کے دوران میں گاہک آ جاتے اور مجع لگ جاتا
ایسے موقع کی اسے دولت پور کی مجلسی زندگی کے متعلق چند ایک باتوں کا علم ہو گیا
تھا۔ مثلاً اسے معلوم تھا کہ سینٹھ گردھاری لال کی حیثیت اب وہ نہیں رہی تھی جو کبھی
پہلے تھی اور اب اس نے ساجو سے تعلقات پیدا کر رکھے تھے۔ اور ساجوں کی یہاں
آتی جاتی تھی اور دولت پور میں ایسا کون تھا جو ساجو سے واقف نہ ہو۔ کون نہیں جانتا
تھا کہ وہ سلئے کی چشم ہے اگر چاہ چشم میں را کھرہ گئی ہے۔ لیکن پھر بھی شو قیں اسے
چوستے تھے اور اس کا دھندا چلتا تھا۔

اسے یہ معلوم نہ تھا کہ سینٹھ گردھاری لال کون ہے اور ساجو کا نام ہے اور وہ
سلئے کی چشم کیوں ہے۔ وہ تو صرف یہ جانتا تھا کہ ساجو کوئی ہے۔ ہو گی کوئی اور سینٹھ
گردھاری لال اسے چوس رہے تھے۔ لیکن اسے اس بات سے کیا تعلق۔

کئی مرتبہ حلوائی بازار کی طرف جاتے ہوئے جب وہ گلی میں سے گزرتا تو اسے
خیال آتا کہ شاید یہی مکان ہو سینٹھ گردھاری لال کا۔ شاید یہی شخص جو چلا آ رہا ہے

سینئی گردھاری لال ہے۔ کیونکہ دولت پور کے سینئیوں اور عوام میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا وہ یکھنے میں ہوا یک سے ہی معلوم ہوتے تھے۔

پھر اسے معلوم ہوا کہ دولت پور میں ایک نیا فتنہ بیدار ہوا ہے۔ جس کی شکل پٹاخہ سی ہے اور جو مست باقی کی طرح چلتی ہے اور شو قین راستے میں کھڑے ہو کر گھنٹوں اس کا انتظار کرتے ہیں۔

اس سلفے کی چشم اور اس نے فتنے کے باوجود ایسی کو دولت پور میں رہنے سے کوئی دچکپی پیدا نہ ہوئی اور بالآخر مجبور ہو کر علی احمد سے کہنے لگا۔ میں یہاں داخل نہیں ہوں گا۔ میں تو لاہور میں پڑھوں گا۔ ”علی احمد نے ایک ساعت کے لیے اس کی طرف غور سے دیکھا اور پھر بدلے۔ ”اس وقت اس موضوع پر بات کرنا بیکار ہے اس لیے کہ ہمیں فرصت نہیں ہے کل دفتر آ جانا تو وہاں یہ مسئلہ حل کر لیں گے۔“

داخلہ

دفتر میں علی احمد کی حیثیت افسر کی تھی۔ ان کے لیے ایک علیحدہ کمرہ مخصوص تھا۔ جس میں بیٹھ کر وہ کام کیا کرتے تھے۔ دوسرے دن ایسی اطمینان سے ان کے دفتر جا پہنچا اور بے تکلفی سے اسلام و علیکم کہہ کر کری پر بیٹھ گیا جو علی احمد کے میز کی دوسری جانب رکھی تھی۔

”ہوں۔“ علی احمد بولے۔ ”تم یہاں داخل ہونے سے انکار کرتے ہو۔“
”مجی ہاں۔“ ایسی نے جواب دیا۔ ”مجھے لاہور داخل کرو اور بیجھے کیونکہ لاہور میں.....“

”ہوں۔“ انہوں نے ایسی کی بات کاٹ کر کہا۔ ”تم یہاں داخل ہونے سے انکار کرتے ہو۔“ یہ کہتے ہوئے انہوں نے بید کی چھڑی اٹھائی جو پاس دیوار کے سہارے کھڑی تھی۔

”تو تم یہاں داخل ہونے سے انکار کرتے ہو۔“ یہ کہتے ہوئے انہوں نے زن

سے سوٹی اس کے سر پر دے ماری۔

”اے۔“ وہ گھبرا گیا۔ اسے اس سلوک کی توقع نہ تھی۔

”ہوں۔“ علی احمد نے کہا۔ ”تم یہاں داخل ہونے سے انکار کرتے ہو۔“ اور سوٹی کی ایک اور ضرب لگائی۔ ایلی گھبرا گیا۔

”دیکھئے آپ مجھے مجبور نہ کریں۔“ وہ بولا۔

”ہوں تم یہاں داخل ہونے سے انکار کرتے ہو۔“ انہوں نے ایک اور ضرب لگائی۔ ”میں کہتا ہوں آپ مجھے مجبور کرو رہے ہیں کہ۔“

زن سے ایک اور ضرب پڑی۔ نہ جائے اس وقت ایلی کو کیا ہوا وہ یہ بھول گیا کہ وہ ایلی ہے اور علی احمد اس کے والد ہیں۔ اس نے ایک جست لگائی اور اس میز پر چڑھ گیا جو باپ اور بیٹے کے درمیان پھی ہوئی تھی۔ جھپٹ کر علی احمد کے ہاتھ کی سوٹی پکڑ لی۔ ایک کھلوتی ہوئی نگاہ باپ پر ڈالی۔

”تو تم دولت پور کے کالج میں داخل ہونے سے انکار کرتے ہو۔“ علی احمد نے وہی فقر اپھر دہرایا۔ ایلی نے ایک جھنکا دے کر بید کی سوٹی علی احمد کے ہاتھ سے چھین لی اور اسے توڑ موز کر ایک طرف پھینک دیا۔ چند ساعت کے لیے وہ علی احمد کے روپر و کھڑا رہا۔ جیسے ان کا حریف ہوا اور پھر میز سے اتر کر چکے سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

دو ایک گھنٹے نہ جانے وہ کہاں گھومتا رہا۔ بھاگ جانے کے خوفناک منصوبے بناتا رہا۔ سوچتا رہا کہ کس طرح وہ سمندری جہاز میں داخل ہو کر چھپ جائے گا اور جب جہاز گھرے سمندر میں پہنچ جائے گا تو وہ باہر نکلے گا۔ اور جہاز والے بالآخر اسے رکابیاں دھونے پر ملازم رکھ لیں گے حتیٰ کہ جہاز بصرہ کی بندرگاہ میں لنگر انداز ہو جائے گا۔ پھر چکے سے جہاز سے باہر نکل جائے گا۔ جیسے اس کے ایک عزیز نے کیا تھا۔

لیکن یہ دلچسپ تفصیلات سوچنے کے بعد وہ گھر لوٹ آیا۔ اس میں بھاگ جانے کی جرأت نہ تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ وہ بھاگ جانے کی تفصیلات بھی نہ سوچے۔ جب وہ گھر واپس پہنچا تو علی احمد اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ”غلام محمد انہوں نے نوکر کو آواز دی ”ایلی کوڈا کٹر رام داں کے پاس لے جاؤ۔“

ڈاکٹر سے دو الگلوانے کے بعد وہ چار پائی پر لیٹ کر فیصلہ کرتا رہا کہ دولت پور کے کالج میں داخل نہیں ہو گا چاہے کچھ ہو جائے لیکن تیرے روڑ جب علی احمد نے اپنے ہیڈکرک کے ساتھ اسے دولت پور کینٹ کالج میں داخل ہونے کے لیے بھیجا تو وہ یوں چکے سے اس کے ساتھ چل پڑا۔ جیسے دولت پور کالج میں داخل نہ ہونے کا اس نے فیصلہ ہی نہ کیا تو وہ چند ایک دن تو ایلی چوبارے کے ان دونوں کمروں میں پریشان حال گھومتا رہا پھر قانع ہو کر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ جب شام کے وقت شیم کھانا پکانے لگتی اور ناظمہ خوانج میں مصروف ہو جاتی اور انجمن کی ناک بہتی تو وہ چکے سے باہر نکل جاتا اور دولت پور کی گلیوں میں گھومتے ہوئے سوچتا کہ یہ مکان سینٹھ گردھاری لال کا تو نہیں اور یہ عورت جو کھڑکی میں کھڑی ہے۔ دولت پور کا نیا فتنہ ہے یا سفعی کی چلم۔

وہ یوں نہیں گھومتا رہتا تاکہ وہ شیم کو کھانا پکاتے ہوئے نہ دیکھے۔ کھانا کھاتے ہوئے وہ سوچنے لگتا کہ کس طرح وہ جہاز میں چھینے میں کامیاب ہو سکے گا۔ اور پھر کس طرح جہاز کا کپتان اسے رکابیاں دھونے پر نوکر کھنا منتظر کر لے گا اور پھر بصرہ کی بندرگاہ میں کس طرح سے چوری چوری جہاز سے اترے گا۔ وہ مسلسل طور پر کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا تاکہ کھانے کے دوران یہ خیال نہ آئے کہ یہ وہی کھانا جسے شیم نے پکایا ہے۔

جمعہ شاہ

پھر ایک روز علی احمد کے بیہاں بالا اور اس کی چچی آگئے۔ آگے آگے بالا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سوٹ کیس تھا اور اس کے پیچے اس کی چچی دیواروں کا سہارا لیتی

ہوئی سیرھیاں چڑھ رہی تھی۔

”سلام کہتا ہوں جی۔“ بالاشیم سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”اپنے پھوپھا جان کہاں گئے ہیں۔ ہوں گے! ہوں گے باہر سیر کو۔ باعین ایلی بھائی بھی بیہاں ہیں۔ مزاج تو بغیر ہے نا۔ شکر اللہ کامیں تو بالکل خیریت سے ہوں۔ علی پور میں بھی خیریت سے ہیں ہاں۔“ اس نے یوں کہا جیسے یہ ایک فسوس ناک امر ہو۔ بھی یاد کرتے ہیں آپ کو۔“ وہ اپنے آپ سے باتیں کئے جا رہا تھا جیسا کہ اس کی عادت تھی۔ خود ہی سوال کرتا۔ پھر خود ہی اس کا جواب دیئے ملتا۔ اس کی نگاہ ہیں نہ جانے کس طرف دیکھنے میں کھوئی رہتی تھیں۔ جیسے دیواروں کے پار پچھہ دیکھ رہا ہو۔ اس کی پچھی بالا کی طرف دیکھنے میں کھوئی رہتی تھیں۔ اس کی نگاہ سے او جمل ہونے دیا گیا تو وہ پر اسرار طریقے سے گم ہو جائے گا۔

جلد ہی شیم اور ایلی کو معلوم ہو گیا کہ بالا اور اس کی پچھی وہاں دو ایک معینے ٹھہر نے کے لیے آئے تھے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ شاید علی احمد کے زیر اثر رہنے سے بالا میں دسویں پاس کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ اگر چہ علی احمد نے ان کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا تھا مگر ان کے انداز سے ظاہر تھا کہ انہیں قطعی طور پر خوشی نہیں ہوئی بلکہ ان کے آنے سے کوفت محسوس ہو رہی تھی۔

بالا اپنے جواہرات کے ڈبے کھول کر بیٹھ جاتا۔ ”یہ دیکھو ایلی۔“ وہ اسے اکساتا۔ ”نیلم جو ہے یہ کوہ سفید کے سوا اور کسی جگہ سے نہیں ملتا ہاں۔ کیونکہ وہی ایک پہاڑ ہے جہاں پر یوں کی آمد و رفت رہتی ہے۔ پر یوں کو نیلم سے محبت ہوتی ہے۔ ہاں۔ پھر جب چوڑھویں رات کا چاند چمکتا ہے نا تو اس کا رنگ اور بھی گہرا ہو جاتا ہے اور.....“

ایلی کو اب بالا کے قیمتی پتھروں سے وہ لچکی نہ تھی جو کسی زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ ایلی اس کی باتیں سن کر مسکراتا اور پھر سوچتا کہ کس طرح بالا کے طسمی پتھروں

مخلصی پائے لیکن اعلانیہ بالا کی بات کاٹ کر چلے جانا یہ اس کے لیے ممکن نہ تھا۔
بہر حال وہ بالا کی باتیں سنتا جما یاں لیتا اور نہ سننے کی آرزو کرتا۔

پھر دفعتاً بالا اٹھو بیٹھتا اور آپ ہی آپ بڑھانے لگتا۔ جیسے کوئی اسے بدار ہا ہو۔
”بھی آتا ہوں۔ بھی۔ بھی آیا میں۔ وہ بدار ہے ہیں نامجھے۔“ اس کے اشاروں
میں رازدارانہ اور پراصر انداز جھلتا۔ اس کی مسکراہٹ میں احساس برتری کی
جھلک ہوتی۔ جیسے وہ حالات کو بہتر طور پر سمجھتا ہو جیسے وہ فطرت کے راز سے کما حقہ
واقف ہو۔ ”فرانتظارِ لگروں میں ہو آؤں۔“ وہ ایسا سے کہتا اور پھر چپ چاپ کوٹھے
کی سیر ہیاں چڑھتے لگتا۔ ان کے جانے نے بعد کوٹھے سے زیریں باقی میں کرنے کی
آوازیں سنائیں۔ ”چھرلوٹ آتا لیکن سیر ہیاں اترتے وقت دخادر کتا جیسے کسی
نے پھر بلایا ہوا اور نہ جانے کس سے مخاطب ہو کر کہتا۔“ نہیں نہیں یوں نہیں۔ جیسے
میں نے کہا ویسے۔“ اور پھر مسکرا اتا ہوا نیچے اتر آتا۔ شیم اور ایسا جیرانی سے اس کی
طرف دیکھتے رہتے۔ اسے آتا دیکھ کر شیم گھبرا کر اٹھو بیٹھتی اور انہم کو کلیجے سے لگا کر
نا ظمہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر گویا نہیں محفوظ کر لیتی۔

پھر وہ گھبرا کر پوچھتی۔ ”بالاتم کس سے باقی میں کیا کرتے ہو۔“

بالا مسکرا دیتا ہے۔ ”آپ نہیں جانتی پھوپھی۔ آپ انہیں نہیں جانتیں۔ اپنی ہی
ہیں وہ۔ بڑے اچھے ہیں بیچارے۔“

بالا جواب دیتا۔ ”کہاں نہیں ہیں۔ ان کے لیے کوئی حد مقرر نہیں وہ ہر جگہ موجود
ہیں۔ ہر مکان میں جنگل میں میدان میں۔ لیکن بڑے اچھے ہیں وہ بیچارے بالا بار
مجھے بلا لیتے ہیں۔ ہی ہی ہی۔“ وہ ہفتتا۔

”اس وقت تو اپنے جمعہ شاہ کو نہیں جانتے بڑے زبردست ہیں وہ جو چاہیں کر
دیں۔ جو چاہیں جسے چاہیں بلا لیں تو یہ بھی کس میں ہمت ہے کہ ان کی بات رو
کرے۔ لیکن میں ہی ہی ہی۔“ وہ ہنسنے لگتا۔ ”میری اور بات ہے۔ میرا ہم زاد

بڑا زبردست ہے نا۔ اس لیے۔ لیکن تمہیں کیا معلوم پھوپھی میں نے کئی بار کہا ہے
انہیں کہ.....“

اور بالا اسی طرح ایک قصہ چھینٹ دیتا۔ جس کے دوران میں وہ بار بار مسکراتا اور
انہیں یوں سمجھانے کی کوشش کرتا جیسے دلوں پنجے ہوں پھر جب رات پڑ جاتی تو وہ
کتاب سامنے رکھ کر دیوار کے پار دیکھنے میں مصروف ہو جاتا۔ اس کی نگاہوں میں
عجیب قسم کی دیوانگی جھلتی۔

ایلی کو بالا کی طرف دیکھ کر فرلاتا تھا۔ اس نے وہ کوشش کیا کرتا کہ اس کی طرف
نہ دیکھے۔ دوسری جانب بالا کی چھپی یوں نیمی رہتی جیسے کپڑوں کی گھڑی پر کسی ڈائن کا
سر کاٹ کر رکھ دیا گیا ہو۔ اس کی نگاہیں بالا پر مرکوز رہتیں اور وہ مسلسل طور پر پیار
بھرگی سیاہ دار نگاہوں سے اسے گھورتی رہتی۔ حتیٰ کہ بالا کی آنکھیں بند ہو جاتیں اور
سر کتاب پر جھک جاتا اور ناٹکیں یوں بکھر جاتیں۔ جیسے معاملے سے بننے ہوئے
باوے کا اندر ورنی تا گالوٹ گیا ہو۔

اس پر دفعتاً کپڑوں کی گھڑی میں حرکت پیدا ہوتی اور چھپی اٹھ کر بالا کے
بکھرے ہوئے اعضا کو سمیٹتی اور بعد مشکل اس لاش کو گھیٹ کر چار پائی پر ڈال
دیتی۔ اس وقت ایلی سوچتا کیا یہ وہی بالا ہے جو فطرت کے تمام رازوں سے کماحتہ
واقف ہے۔ کیا یہ بے ہوشی بھی کوئی راز ہے۔ یہ سوچتے سوچتے ایلی اوٹگھنے لگتا اور پھر
چپکے سے اٹھ کر بستر پر لیٹ جاتا اور علی احمد کے قلم کی چراوں چراوں کو غور سے سننے
میں مصروف ہو جاتا جو ماحقہ کمرے میں حسابات کے رجسٹر پر کرنے میں مصروف
رہتے۔ ایلی کو خوف دامن گیر رہتا تھا کہ کہیں علی احمد یہ نہ پوچھ لیں۔ ”ایلی تم ابھی
سے سو گئے کیا سارا دون آوارہ پھرتے ہوا اور سر شام ہی پڑ کر سو جاتے ہو کیا وجہ ہے۔“
لیکن علی احمد کو حساب کتاب لکھنے میں اس قدر دلچسپی تھی کہ وہ رجسٹر سامنے رکھ کر دنیا و
ما فیہا سے بے خبر ہو جاتے تھے۔

آتشیں میزائل

رات کو خواب میں عجیب و غریب اشکال ایلی کے پیچھے دوڑتیں اور وہ ڈر کر بھاگتا۔ خوف سے اس کے رو نگئے کھڑے ہو جاتے۔ دل دھڑکتا۔ مگر وہ دوڑے جاتا۔ پھر بالا نہ جانے کہاں سے اس کے سامنے آ کھڑا ہوتا اور مسکراتا۔ اس کی مسکراہٹ کو دیکھ کر عجیب قسم کی ہمدردی سی محسوس ہوتی تھی۔ کوئی بات نہیں کوئی بات نہیں۔ ”بالا مسکرا کر کہتا ٹھیک ہو جائے گا۔ بالا کا چٹا سفید ہاتھ ایلی کی طرف بڑھتا اور اسے تھپکنے لگتا۔ ایلی جاگ اٹھتا اور اپنے آپ کو کمرے میں دیکھ کر اطمینان کا سنس لیتا۔ پھر آہستہ آہستہ از سرفواں پر خوف مسلط ہونا شروع ہو جاتا۔ اندھیرے میں اس کا دم گھٹنے لگتا اور وہ آنکھیں بند کر کے پڑ جاتا۔ وقتاً سے محسوس ہوتا کہ کوئی چیز اس کے جسم سے چھوڑی ہے۔ آہستہ آہستہ حرکت کر رہی ہے۔

پہلی مرتبہ جب اس نے یہ محسوس کیا تھا تو وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا تھا۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ صرف بالا کا بازو چار پائی تلے یوں لٹک رہا تھا۔ جیسے قصائی کی دوکان پر بکرے لکھا کرتے ہیں۔ یہ بات تجھب خیز نہ تھی۔ کیونکہ اکثر بالا کے اعضا چار پائی سے لکھا کرتے تھے۔ اس نے کئی مرتبہ اس کا بازو اور ناگ چار پائی تلے دیکھے تھے اور بالا کی چھپی تو اکثر رات کے وقت چلا یا کرتی۔ ”بالا تیری دوسری ناگ کہاں ہے۔ بالا کہاں ہے۔ تیری دوسری ناگ۔ پھر وہ اٹھ کر بالا کی دوسری ناگ سمیٹتی اور گھڑی بن کر بالا کی پائیتی کی طرف پڑ جاتی اور بالا اسی طرح سویا رہتا یا زیریں مسکرا کر آنکھیں یوں بند کر لیتا جیسے نیند میں ہو۔

بالا کے جسم کے متعلق ایلی کے لیے دو تین باتیں عجیب تھیں۔ ایک تو اس کا جسم سفید اور ملامم تھا۔ جیسے عورتوں کا ہوتا ہے۔ دوسرے وہ بالوں سے خالی تھا۔ اس کے ہاتھ اس قدر حساس تھے کہ ایلی کو حیرت ہوتی تھی۔ انکیاں مخروطی تھیں اور جلد پر یوں گلابی جھوال سی چمکتی تھی جیسے ناٹکوں کی باریک جھلکی چڑھا رکھی ہو۔

اس روز بالا کا ہاتھ چار پائی سے لٹکتے دیکھ کر ایلی کو تعجب نہ ہوا تھا۔ بلکہ اس نے آنکھیں بند کر کے سو جانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اسے نیند ن آتی تھی۔ نہ جانے نیند کو کیا ہو گیا تھا۔ کمرے کے اندر ہیر سے نجات پانے کے لئے اس نے سیٹھ گردھاری لال کے متعلق سوچنا شروع کر دیا تھا۔ نہ جانے سیٹھ گردھاری لال کیسا ہو گا۔ اس کے سلسلے کی چلم سا جو اور دو پٹا خہ۔ نہ جانے کون تھی۔ وہ..... جو دولت پور میں پٹا خہ سمجھی جاتی تھی۔ کوئی ہوئی۔ پڑی ہوا کمرے۔ ایلی نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ دفعتاً اس نے پھر وہی لس محسوس کیا۔ وہی جنبش جیسے کوئی قدمتی بیرونی چل رہی ہو۔ وہ پھر چونکا بیرونی رک گئی۔ لیکن پھر دیریا کے بعد پھر سے چلنے لگی۔ اگرچہ جنبش چونکا دیتی تھی۔ لیکن اس قدر بہم تھی۔ وہ لس اس قدر قدمتی تھا کہ ایلی میں عجیب سی لذت بیدار ہو رہی تھی۔ جیسے تین بھولے پچکے سے اس کی رضائی میں گھس گئے ہوں۔ بیرونی کی ہر جنبش پروہ بدد کتا اور اس کے بد کتے ہی وہ بھولا رک جاتا۔ وہ لس جامد ہو کر رہ جاتا لیکن اس گھبراہٹ کے باوجود ایلی کا جی چاہتا کہ وہ جنبش پھر روای ہو جائے وہ بیرونی پھر چلنے لگے۔ اس لس کی وجہ جانے کے لیے اس نے رضائی سے باہر دیکھنے کی خواہش محسوس کی تا کہ اسے معلوم ہو کہ بالا کا بازو کیا وہیں لٹک رہا ہے۔ لیکن عین اس وقت وہ جنبش پھر روای ہو چکی تھی۔ ایلی نے رضائی سے منہ نکال کر باہر دیکھنے کی خواہش کو دبایا کہ پہنے کی وجہ سے وہ بیرونی رک نہ جائے۔

بیرونی سرک رہی تھی۔ سرک رہی تھی۔ اس کے جسم کے ایک ان جانے مرکز سے چاروں طرف لہریں اٹھ رہی تھیں۔ وقت گویا ہتم چکا تھا۔

پھر دفعتاً ایک گرداب اٹھا۔ وہ ہلکی ہلکی لہریں ایک عجیب سے طوفان میں بدلتیں۔ ایک آتشیں میزائل فضا میں بلند ہوا اور پھر ایٹم بم کی طرح پھٹ گیا۔ چاروں طرف چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔ ستارے ٹوٹ رہے تھے۔ پھر گھٹا ٹوپ

اندھیرا چھا گیا اور ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ ایک طویل و عریض سمندر پر ایک ٹوٹی ہوئی کشتی میں بہے جا رہا ہوا اور چاروں طرف تھکی ہاری لہریں رینگ رہی ہوں۔

اس روز پہلی مرتبہ اسے اس تلاطم کا تجربہ ہوا تھا۔ پہلی مرتبہ اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کی اپنی شخصیت میں رکھنے طوفان پہنچا ہے۔ اگر روزہ بالا کے ہاتھ کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ کتنا شفاف ہاتھ تھا وہ کس قدر ظلمیں۔ اسے دیکھ کر ایلی کو بیک وقت نفرت اور ویچپی محسوس ہو رہی تھی۔ نفرت کا احساس غالباً تھا۔ مگر اس نفرت کے باوجود رات کی تاریکی میں اس چھائی ہوئی خاموشی کے پس منظر پر دھمل لمس روایں دواں ہو جاتا تو اسے محسوس ہوتا گیا کسی برابطے کے تاریزہ ہے ہوں۔ اس وقت وہ پہلو بدلتے آپ کو محفوظ رکھتا۔ لیکن جلد ہی ان جانے میں وہ پھر کروٹ بدلتا۔ اور پھر مختلہ لہریں بڑھ کر طوفان کی شکل اختیار کر لیتیں افق پر خونیں چھینتے اڑتے ایک میزائل شوں سے آسمان کی طرف لپکتا۔ پھر دیر تک طوفان زدہ سمندر کی ویرانی میں وہ لکڑی کے ٹوٹے ہوئے تختوں پر پڑا ڈکیاں کھاتا اور کسی ان جانے احساس سے شرابور ہو جاتا۔ دن بھر وہ کالج سے متعلق مشاصل میں مصروف رہتا۔ شدت سے مصروف رہتا تاکہ اس کے ذہن میں بالا کا خیال نہ آجائے۔ بالا کے رو برو جانے سے بھی اسے سخت تکلیف ہوتی تھی۔ روحانی تکلیف۔ بالا اس کے ذہن میں ایک رستے نا سور کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ لیکن۔

پیس میموریل

دولت پور کا کالج ایک وسیع احاطے میں طویلاً نما عمارت میں واقع تھا۔ احاطے کے چاروں طرف ایک منزلہ کمرے بنے ہوئے تھے۔ جن کے ساتھ ساتھ ایک برآمدہ چلا گیا تھا اور درمیان میں ایک وسیع و عریض صحن تھا۔ جس میں دو ایک پلاٹ دو ایک ٹینس اور بیٹھ منٹن کے کورٹ تھے اور درمیان میں کنکر بچھے ہوئے راستے بنے ہوئے تھے۔

احاطے کا شریق پہلو تعلیم و مدرسے کے لیے مخصوص تھا اور باقی تین پہلوؤں میں بورڈنگ طلباء کے رہائشی کمرے تھے جو زیادہ تر خالی پڑے رہتے۔

اس کالج کی حیثیت محسوس ایک سکول کی سی تھی۔ احاطے کے دونوں پہلوؤں میں سٹولوں پر بیٹھے چوکیدار اونگختے۔ کالج ونگ کے برآمدے میں ڈھیلے ڈھالے چپڑے اسی ہاتھوں میں کاغذ تھامے نگے پاؤں یوں گھومتے پھرتے جیسے بھکشو چل رہے ہوں۔ دفتر میں لا الہ رام لا الہ ہی ہی فکر پشمہ ناک کی چونچ پر لوگھے بڑے بڑے رجسٹروں میں اندر اج گرنے میں مصروف رکھائی دیتے۔ ان کے ارد گرد کم سن فکر حساب کتاب کے ھاتے گھوملے بیٹھے رہتے۔

جماعتوں میں پرفیشنر لگنی آواز سے پڑھاتے اور لڑکے بچوں پر بیٹھ کر اونگختے۔ بورڈنگ کے ویران کمروں میں الیوں پر ڈھونتیاں لگوٹیاں اور پرانے سوکھتے۔ رسولی میں وال کی کڑا ہیاں بجھتیں۔ چوہبھے سے پھلکے اڑتے اور باہر بچھی ہوئی ڈائینینگ ٹیبل پر لڑکوں کے بے صبرے ہاتھ انہیں کچ کرنے کے لیے بڑھتے۔

دولت پور کالج کا نام پیس میموریل تھا جو کسی بڑے سیٹھ نے لوگ رکشا کیلئے جاری کیا تھا۔ شاید اسی لیے کالج میں پیس صلح اور شانستی کے سوا کچھ نہ تھا۔ لڑکے شانستی سے اونگختے۔ چپڑا اسی آواز پیدا کیے بغیر برآمدوں سے چلتے پھرتے۔ دفتر میں ہیڈ فکر کے قلم کے چراوں چراوں کے سوا کوئی آواز پیدا نہ ہوتی۔

اس پیس میموریل کالج میں صرف ایک گروپ ایسا تھا جو اس چھائی ہوئی خاموشی کو توڑنے کی کوشش کرتا۔ لیکن بسا اوقات ان کی یہ کوشش بری طرح سے ناکام ہو جاتی۔ یہ گروپ دولت پور کے شہر کے مسلمان لڑکوں کا تھا۔

شہر کے لڑکے صحیح سوریے اپنے بائیکل سنبھالتے اور چھاؤنی کی طرف چل پڑتے جہاں کالج واقع تھا۔ شہر سے نکلتے تو تعداد کے لحاظ سے ایسا معلوم ہوتا جیسے سائیکلوں کا ایک جلوس نکلا یا سائیکلوں کی ریس ہو رہی ہو۔ یہ جلوس گپیں اڑاتا۔ شور

مچاتا۔ شانوں پر ہاتھ رکھے ہینڈل چھوڑے قطار در قطار چلے جاتا۔ ان کے اس طور پر چلنے سے چھاؤنی اور شہر کے درمیان کی سڑک کا ٹریفک رک جاتا۔ تانگے والے چھختے رہے بابو۔ فتح کے بابو۔ بیل گاڑی والے چلاتے۔ ٹریفک کے سپاہی سیٹیاں بجاتے۔ ویران کوٹھیوں میں نے صاحبوں کے کتنے نکل کر بھونکتے۔ لیکن وہ جلوس بے نیازی اور بے پرواہی سے چلتا۔

ان کی زبانیں قیچیوں کی طرح چلتی تھیں۔ نگاہیں گوندگی طرح چپک جاتیں۔ چہروں سے شوخیاں جھلکتیں بھجوؤں میں مستیاں لہراتیں۔ ہونتوں پر مسکراہیں ابھرتیں۔ ایک دوسرے کو لئے ابنا نے کی کوشش کرتا۔ دوسرا دل پھینک عاشق کاروپ دھار لیتا۔ ایک شریف کی سی آنکھیں بناتا۔ دوسرے علی احمد کی طرح میدان میں آ کوتا۔

ایک کہتا۔ ”کیوں ہیری جان دیکھو گے یا مارہی ڈالو گے۔“

دوسرا کہتا۔ ”کیوں بے سالے ہماری ہی ٹلی اور ہمیں سے میاواں۔“

”کیوں سالے ہم سے تو چھپتا ہے اور دوسروں سے آنکھیں اڑاتا ہے۔“

”بھی ہم تو سر کار کا رکن کر ٹھہرے۔“

”تو مشق نا ذکر بے خون دو عالم ہماری گردن پر۔“

”ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں۔ جان من۔“

ہر کسی کو شوق تھا کہ وہ عاشق کاروں ادا کرے اور دوسروں کو معشوق بنا کر رکھ دے۔ دولت پور کے لڑکوں کا صرف یہی ایک مذاق تھا۔ ان کے پاس بات کرنے کے لیے صرف یہی ایک موضوع تھا۔ جسے بات کرنی آتی تھی۔ جو چوٹ کر سکتا تھا۔ فی المبدی یہ چست جواب دے سکتا تھا، وہ ہیر و بن جاتا اور جوڑ کے ازی طور پر گنگے تھے وہ نگوبن کر رہا جاتے۔

ایلی ازی طور پر ایک گونگا لڑکا تھا۔ اسی وجہ سے اس کے لیے ان کی باتیں بے حد

پریشان کن ہوتی تھیں۔ اور وہ جلوس خاصہ افیت وہ۔ اس لیے وہ اکثر کوشش کرتا کہ ایسے وقت کا لج جائے جب لڑکوں کے جلوس میں شامل ہونے کا ذرہ نہ ہو۔

یہ جلوس جب کا لج کے دروازے پر پہنچتا تو اور بھی شور مچاتا۔ لیکن ان کا وہ شور بے جان ہو کر رہ جاتا کوشش کے باوجود اس میں تسلسل پیدا نہ ہو سکتا۔ اس راہب خانہ نما احاطے میں عجیب خصوصیت ہے۔

اس احاطے میں بڑی سے بڑی شوخی بات بے جان ہو کر رہ جاتی۔ بڑی سے بڑی کھجوری فلیٹ ہو جاتی جیسے محراجیوں کی ہزاری خشک ہول رائجاتی ہے۔

یہ جلوس احاطے میں داخل ہوتے ہی بے جان ہو جاتا۔ لڑکوں کے ہونٹ خشک ہو جاتے۔ انکے علق کی آوازیں جم جاتیں اور وہ چپ چاپ کلاس روم میں پیش کر اوپنگھنے لگتے اور چھٹی کا انتظار کرتے تاکہ ایک بار پھر حرکت کر سکیں۔

پیس میموریل کے پروفیسر بھی عجیب تھے۔ ان میں شوخی یا بانگلپن نام کا نہ تھا ان کے لباس بھر کیلئے نہیں بلکہ بد رنگ تھے۔ ان کی حرکات اس حد تک مددھم تھیں جیسے سلو مو و منٹ پر فلم چل رہا ہو۔ ان کی آوازیں احاطے کی خاموشی کو تقویت دیتی تھیں۔ ان کے پیکھروں میں بھی علمی نمائش مفتوح تھی۔ پیکھر دیتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے معلومات کا پرچار کرنے کے بجائے وہ اپنے علم کے عجز کا اظہار کر رہے ہوں۔ لڑکے ان کے اس انداز پر تمثیر سے ہستے تھے۔ اگرچہ چوری چوری ہستے تھے۔ لیکن پروفیسروں کے بر تاؤ کو محسوس کر کے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کا لج کی جگہ وہ ایک بودھی راہب خانہ ہو جہاں لوگ علم کی بجائے شانتی کا اپدیش سیکھ رہے ہوں۔

ایلی کے لئے وہ کا لج خوش کن نہ تھا۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ وہاں احساس کمتری کی وجہ سے اسے بھاگنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ اس لئے وہ کا لج میں باقاعدہ جاتا۔ اگرچاں نے کبھی پروفیسر کے پیکھر کی طرف دھیان نہ دیا تھا۔ جماعت میں وہ اوگلتا۔ رسمیس میں لڑکوں کی باتیں سنتا اور خالی پیغمبر یہ میں انہیں کسی ویران کمرے

میں تاش کھیلتے ہوئے دیکھتا رہتا یا کالج سے نگل کر چھاؤنی کے بازاروں میں گھومتا۔
کالج کے بند ہونے کے بعد وہ سیدھا گھر آتا۔ لیکن جوں جوں وہ گھر کے
قریب پہنچتا اس کا دل پیٹھنے لگتا نہ جانے علی احمد کے کمرے میں کون ہوگی۔ نہ جانے
شمیم کی پچیاں صحن میں پیٹھی کیا کر رہی ہوں گی۔ ہمارے گھر میں کوئی کونہ بھی تو ایسا نہ
تھا جہاں وہ الگ تنہائی میں بیٹھ سکتا ہو۔

کچی گری

پھر دولت پور میں پنچھے کے میلے کا دن آ گیا۔ شہر کے پتواریوں کی دوکانوں پر
بھیڑ لگ گئی۔ لوگ پان کھاتے پیکیں جھوکتے ایک وہ مرے پر فقرے کتے۔ مذاق
اڑاتے اور بالآخر شہر کے بیٹھوں اور پناخوں کے متعلق بات شروع کر دیتے۔
”کیوں بھی غلام محمد کون کون آ رہی ہے اب کے پنچھے کے میلے
ماں.....“

”اپنی زہرہ ہے دلی والی۔ علی جان ہے اور پٹیا لے کی زدی بانو ہے۔“

”بڑی اچھی اچھی آئیں گی۔ اب کی بار بڑا ٹھاٹھ در ہے گا۔ تو دیکھیو تو۔“

”کیوں رے بڑا تان سین آیا ہے تو سمجھنے والا راگ و دیا کا۔“

”اچھا خاصتو گاتی ہے وہ اور جب ہاتھاٹا کر کوئے مٹکاتی ہے تو دیکھ لجو تو تیرے
جیسوں کے دل کونہ ہوا کچھ کچھ تو کہنا۔“

”اے یار تو بھی بس لفاؤ ہی رہا۔ یہاں گانے میں اپنی زہرہ کا جواب نہیں اور
پھر دیکھنے میں بھی تو پچھن چھری ہے نری۔“

”ہونہہ دیکھنے میں تو وہ ہے جو آج دل شہر کی آنکھ کا تارہ بنی ہوئی ہے اور بھی
ہے بھی یوں سمجھ لو کچی گری۔ رضائی میں پڑ کر چباتے رہو۔ ہاں۔“

پھر وہ سب اس کچی گری کو چبتے اور اپنی تخيّل میں کھو کر پان کی پیک نگل جاتے
اور پھر کھانستے اور چلاتے۔

”کیوں بھی گلام محمد بڑا تھا ہے۔ تیرا تمبا خوکہاں سے منگوایا ہے اب کی مرتبہ۔“
غلام محمد ایک شان بے نیازی سے چلاتا۔ ”ابے کیا سمجھا ہے تو نے اپنی دوکان پر
چیج وہ آتی ہے۔ جواول درزے کی ہو۔ ہاں۔“

میلے کے دون شہر میں گھومتے ہوئے راج چوک میں مرزا کی دوکان کے قریب
اپنی ان کی باقیتین سن کر جھکا۔

”ابے وہ سامنے تو ہے وہ شیخ کی دوکان کے اوپر جھرمٹ لگا ہے تا اس میں تو غور
سے تو دیکھیں ہیں تیری یا بین جو کہ دیکھنے کی چیج رکھتی ہی نہیں۔“

”وہ تو اپنی بالیاں والی ہے۔ پٹاخہ کہاں رکھتا خود کو نہیں الٹا، ہمیں جھٹائے ہے۔“

”ہاں ہاں بالیاں والی کے سامنے ہی تو ہے۔ بائیں باتح کو ابے کیا ابھی سے
آنکھوں پر چنا آگیا۔ کہا جو ہے تجھ سے بیسیوں بار چھوڑ دے یہ جیادتیاں۔ اندھا ہو
کر راج چوک میں لاٹھی نہیں تو نے تو اپنانام مر جانیں۔“

اپنی غور سے دوکان کی چھت پر بیٹھی ہوئی عورتوں کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں بھڑکیے
ستے کپڑے پہنے چند سالوں کی عورتیں بیٹھی تھیں۔ جن کے انداز میں نمائش کے علاوہ
عربی کی جھلک تھی۔ اس نے محسوس کیا۔ جیسے وہ سب بکاؤ ہوں۔ جنہیں ستے
واموں خریدا جاسکتا ہو۔ تو کیا یہی تھی وہ دولت پور کی پٹاخہ جو ہوائی بن کر چھوٹی ہوئی
تھی شہر میں۔

”دیکھ لیا۔“ مرزا قہقهہ مار کر ہنسا۔ ”بڑے جوروں میں ہے آج کل یہ لہڈ یا۔
اپنی لطیفن کی لہڈ یا ہے یاے وی لطیفن جو منڈی میں دانے چھانتی ہے۔ اپنے سیٹھ
مجید الرحیم کی دوکان پر تین بہنیں ہیں۔ بڑی نے سیٹھ گردھاری لال کو سنبھال رکھا
ہے اور۔“

”اور کیا بے سلفے کی لاث کو کون نہیں جانتا۔ جانتا ہوں اسے اچھی طرح یوں۔“
”پر یا راس جالم پٹاخہ نے چکر دیا ہے سارے شہر کو۔“

ایلی جیرانی سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لوگ کس معیار سے انہیں پر کھتے تھے۔ نہ جانے کس نقطہ نظر اسے انہیں عورتوں حسین نظر آتی تھیں۔ دولت پور کے پنواؤں کی بات تو خیر الگ تھی۔ اپنے علی احمد کے خیالات بھی اس سلسلے میں عجیب تھے۔ ایلی کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ وہ چھپ چھپ کر ان عورتوں کو گھر رہا تھا جو شیخ کی دوکان پر بیٹھی پنکھوں کے جلوں کا انتظار کر رہی تھیں۔

”تو یہاں کیا دیکھ رہا ہے؟“ علی احمد کی آواز سن کرو۔ چون کہا۔
”جی۔ جی۔ یونہی دیکھ رہا تھا۔“

”اس طرح پاگلوں کی طرح ادھر ادھر نہیں دیکھا کرتے۔“ علی احمد نے کوہبوں پر ہاتھ رکھ کر شیخ کی دوکان پر بیٹھی ہوئی عورتوں کی طرف بڑے اشہاک سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اچھا تو ابھی جلوس یہاں نہیں پہنچا ہوں۔“ انہوں نے ایلی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”ابھی دیر میں پہنچ گا یہاں ہوں۔“

پھر وہ اسی طرح کوہبوں پر ہاتھ رکھ کر وہاں ٹھہلنے لگے۔ علی احمد نے جانے کیا کیا۔ شیخ کی دوکان پر بیٹھی عورتوں میں سے ایک نے بامعنی انداز سے دوسرا کو کہنی ماری اور پھر مسکرا کر اٹھ بیٹھی۔ اسے اٹھتے دیکھ کر علی احمد بولے۔ ”آؤ ایلی ذرا ادھر سے ہو آئیں۔ اس طرف۔“ اور وہ ایلی کو لے کر چوک کے عقب کی اندر ہیری گلیوں میں گھس گئے اور ایک جگہ رک کر گویا کسی کا انتظار کرنے لگے۔

ان گلیوں میں عورتوں کے گروہ ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ نہ جانے کیوں ایلی کو دولت پور کی عورتوں سے گھن آتی تھی۔ ان کا انداز چال ڈھال، طور طریقہ گھشا قسم کا تھا۔ وہ عجیب کپڑے پہنچتی تھیں۔ سستے اور بھڑ کیلے ان کی حرکات میں کوئی حسن نہ تھا۔ ان کا انداز تکلم تو بالکل ہی گنوار پن کا مظہر ہوتا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کا رنگ عموماً کالا تھا اور کالے رنگ سے ایلی کو قطعی دلچسپی نہ تھی۔

بلوری پاؤں

دولت پور میں کہیں کہیں سفید رنگ کے لوگ بھی نظر آتے تھے مگر ان کی تعداد بہت کم تھی مثلاً علی احمد کے چوبارے کے سامنے جو بیٹھا بیٹھا سا کچا گھر تھا۔ اس میں وہ لڑکی جو بھی کھار کوٹھے پر چڑھا کرتی تھی اور پردوں کے پیچھے چھپ چھپ کر بیٹھا کرتی تھی اس کا رنگ کتنا سفید تھا۔ اس کے انداز میں نماش کا نشان تک نہ تھا۔ پہلی مرتبہ جب ایلی نے اسے دیکھا تھا تو وہ حیران رہ گیا تھا۔ پردے کی جالیوں کے پیچھے دو بلوری پاؤں گویا بڑی نفاست ہے چار پالی پر رکھے ہوئے تھے اور ان کے روپ و دو مخروطی نانگیں جو میلے لئے کے پا جائے میں ملبوس تھیں۔ ایلی نے پہلی مرتبہ پا جائے کے حسن کو محسوس کیا تھا۔ چور کی دار پا نجات دو اس نے اکثر دیکھا تھا مگر اسے دیکھ کر نفرت محسوس ہوئی تھی۔ جیسے وہ پتلے پتلے بانسوں پر چڑھا ہو۔

دولت پور کی عورتوں کا انداز اتنا بھدا تھا۔ ان کی حرکات اس قدر بے ڈھب تھیں۔ ان کی نگاہیں جواب سے اس قدر بے بہرہ تھیں کہ ایلی نے ان کے لباس کی خوبی پر بھی غور ہی نہ کیا تھا۔ اسی لیے اس روز اس لڑکی کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا تھا۔ کتنی متناسب نانگیں تھیں اور پھر بلوری پاؤں پھر دفتاً ایک سر میلی دلبی آواز فضا میں گونجتی۔ ”آتی ہوں۔“ اور وہ جھک کر چھپتے چھپتے پردوں کی اوٹ لیتی ہوئی غائب ہو گئی تھی۔

ایلی کی سمجھیں نہ آتا تھا کہ اس اندر ہیری گلی میں ان آتے جاتے جامنی سالیوں کو دیکھنے سے علی احمد کا مقصد کیا تھا۔ وہ وہاں کس لئے کھڑے ہر آتے جاتے کوتائے کی بے معنی کوشش میں مشغول تھے۔

میلے

”تم ہو بابو جی۔“ قریب ہی سے آواز آئی۔ ایلی چونکا۔

اندر ہیرے میں علی احمد کے دانت چمکے۔ ”تم آگئیں۔ ہی ہی ہی۔“ ٹین کا سپاہی

اپے مخصوص انداز میں ہنسا۔

”پھر تم نے جو اشارہ کیا تھا۔“ ریڑ کی گڑیا کی آنکھوں کی سفیدیاں چمکیں۔

”ای ہی ہی تو تو نے دیکھ لیا۔“ وہ بولے۔ ”میں تو سمجھا تھا شاید۔ ای ہی ہی۔“

”کیسے نہ دیکھتی۔“ وہ چیل گربولی۔

اس کا دھیان تو تمہاری طرف ہی لگا رہتا ہے۔ قریب ہی چادر میں لپٹا ہوا ایک

مرد گلنگیا۔

اس کی آواز سے سیلو میں شپ گی بو آتی تھی۔

”تو خواہ خواہ۔“ وہ لاڑ سے غرائی۔ ”تو نہ بول جج ماں۔“

علیٰ احمد یوں نہے جا رہے تھے جیسے ان کی شان میں قصیدہ پڑھا جا رہا ہو۔

”اچھا تو۔“ وہ بولے۔ ”چلے گی اب۔“

”اب۔“ وہ چونگی۔ ”نه بھئی ہم تو پنکھا دیکھ کر جاویں گے۔“

”بڑی متواالی ہے پنکھے کی۔“ سیلو میں ہنسا۔

”متواالی ہی تو ہے۔“ ٹین کے سپاہی نے گویا پھروار کیا۔

”میلے دیکھ کر پنکھوں گی۔ ہاں۔ پھی بات کہوں گی۔“

”میلے تو تم خود ہو۔“ علیٰ احمد قہقہہ مار کر بنے۔ ”دنیا دیکھ رہی ہے۔“

”اوی۔ جھوٹ۔“ اس نے لاڑ سے گویا شکایتا کہا۔ ”کوئی بھی تو نہیں دیکھتا۔“

”ای ہی ہی۔“ وہ بنے۔ ”وہ تو انگلیاں اٹھا رہے تھے۔ تمہاری طرف۔“

”پڑے اٹھائیں۔ اپنی بلائے۔ اور وہ میری چیج لائے ہو۔“

ٹین کے سپاہی کا قہقہہ یک قلم موقوف ہو گیا۔ ”اوہ مجھے یاد نہیں رہا۔“ وہ سنجیدگی سے بولے۔

”وہ کیوں یاد رہنے لگا۔“ وہ بگڑ کر بولی۔

”بھیج دیں گے۔ بگڑتی کیوں ہو۔“

”کیوں نہ بگڑوں بس ایک ہی بات یا درستی ہے تمہیں۔“

”ایلی کے ہاتھ بھیج دوں گا۔ یہ ایلی ہے میرا لڑکا۔“

”اچھا تو یہ ہے ایلی۔ وہ لاڑکے چلائی۔ پڑھتا اے تو۔“

”صحمل لینا اس سے اپنی چیز بھی لے لیتا۔ علی احمد بولے۔ ”چلو ایلی۔“

اس کے جانے کے بعد وہ بولے۔ ”چلو تمہیں میلہ دکھادیں۔ دیکھو گے نا۔“

اگلے روز صحمنور ہے جی علی احمد نے ایلی کو آواز دی اور اس کے ہاتھ میں ایک دس کا نوٹ دے کر ایک گھٹری تی تھادی۔ ”یہ ادھر لے جائے وہ بولے۔ ”غلام محمد چپڑ اسی باہر کھڑا ہے وہ تمہیں ساتھ لے جائے گا۔ نوٹ جیب میں ڈال لوگر نہ جائے اور یہ گھٹری اسے دے دینا۔ غلام محمد کو وہ اٹھا لے گا۔“ سمجھے۔ غلام محمد۔ انہوں نے چپڑ اسی کو آواز دی۔ ”ایلی کو ادھر لے جاؤ۔“

ادھر کا نام سن کر شیم سر تپ اٹھی۔ اس کی ناک پر حفارت آمیز جنبش ہوئی اور وہ گویا انتقام آپھو اڑے کی کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ جس کے عقب میں کوئی پڑھے پروہ نوجوان کھڑا انتظار کیا کرتا تھا۔ اس نے اپنا دوپٹہ بخنوڑ کر پھینک دیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک بامعنی مسکراہٹ پھیل گئی۔ باہر میں کھانس رہے تھے۔ کھڑکی میں بیگم مسکرا رہی تھی۔ پنگ پر پڑی ہوئی پچھی ماں کی طرف دیکھ کر رورہی تھی اور نسخی فاطمی چاروں طرف غور سے دیکھ رہی تھی۔ جیسے گرد و پیش کے حالات سے آشنا ہونے کی کوشش کر رہی ہوا اور ایلی اچھلتے ہوئے دل سے بیٹھیاں اتر رہا تھا۔

جنکیں اور جسم

بازاروں اور گلیوں کا ایک لمبا چکر کاٹ کر ایلی کا رہبر ایک معمولی سے مکان میں داخل ہوا۔

صحن میں ایک سیاہ فام بڑھیا جھاؤ دے رہی تھی۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ چہرہ ابلے ہوئے اٹھے کی جامد و ساکت تھا۔ پیشانی پر ٹکن تھے۔ انہیں داخل

ہوتے دیکھ کر وہ رک گئی اور بے باکانہ طور پر انہیں گھومنے لگی۔ پھر کوئوں پر ہاتھ رکھ کر کوئوں کھڑی ہو گئی جیسے ہاتھ کے جھاؤ سے تو اضع کرنے کے لیے تیار ہو۔

”آگئے تم۔“ بڑھیا غرائی۔

”کون ہے ماں۔“ اندر نے آواز آتی مان۔ ایسی گھبراگیا کیا یہ اس کی ماں تھی

۔ ماں

”تیرے ہی پچھوں گے مجھے کیا مالوم۔“ وہ غرائی۔

”اے گرمی کیوں کھا رہی ہے تو ماں۔“

”گرمی تو تیری بھندی ہونے میں نہیں آتی۔“

”تو تجھے کیا تخلیف ہے تو کے کل حاصل بن کر بیٹھ رہ آرام سے۔“

”لہو لگا ہے تجھے لہو، اندھی ہو رہی ہے ہر آستے جاتے سے بخرا ملتی ہے۔“ بڑھیا

چھٹنے لگی۔

”اوہ غلام محمد تو ہے۔ آ جا۔ اندر آ جا۔“ کمرے سے کسی نے جھانک کر کھا۔

”بس لگاتی جاتو سینے سے۔“ بڑھیا غرائی۔ ”اور تیرا کام ہی کیا ہے مجھے کیا معلوم تھا کہ گود میں کتیاں پال رہی ہوں۔ کتیا یہ سب اس حراثی ساجو کا کام ہے اس شکارن نے سب کے منہ لہو لگا دیا۔ لہو چوتی ہیں۔ لیکن کب تک۔“ اس کے منہ سے کف جاری تھا۔

”بڑی گرم ہے بڑھیا آج راجو۔“ غلام محمد نے آنکھیں جھپکا کر کھا۔

”اس کا کیا ہے۔ یونہی بولتی بکتی رہتی ہے۔“ راجونے نخڑے سے جواب دیا۔ غلام محمد اس سے قریب تر ہو گیا۔ اس کی نگاہوں میں عجیب سی چمک تھی۔ ایسی چمک جو کسی چپڑ اسی کی آنکھ میں نہیں ہوتی۔

”ساجو کو کوستی ہے۔“ وہ نہ سا۔ ”تجھے نہیں۔“

راجونے ایک انداز سے زبان ہونٹوں میں لے لی اور وہ مرے کو نے میں بیٹھی

ہوئی عورت کی طرف دیکھا۔

دوسراے کونے میں ایک پست قد فربہ سیاہ فام عورت چارپائی پر بیٹھی پان لگا رہی تھی۔ اس کی انگلیاں انگوٹھیوں سے لمبی ہوئی تھیں۔ ابھرے ابھرے گالوں میں یوں رینگ رہی تھیں۔ جیسے ڈبل روٹی میں سیاہ دروازیں پڑی ہوں۔

”ابھی ساجو کا کیا دیکھا ہے اس بڑھیا نے۔“ وہ بولی۔ ”ابھی تو دیکھے گی۔

غضب خدا کا اسے ٹھیکی کی روٹی ہشم نہیں ہوتی۔ سو کھے مکڑوں کے بغیر جی نہیں سکتی ہے۔“

ساجو کے ابھرے ہونے گالوں اور موٹ انگلیوں پر گویا جملی حروف میں حرص و ہوس کندہ تھا۔ اس کے ہوتیوں کو دیکھ رہا یعنی محسوں کر رہا تھا۔ جیسے جو نکیں ہوں۔ نہ جانے کیوں ایلی کو لگ رہا تھا۔ جیسے ساجو سرخ گوشت کا ایک لوٹھرا ہو۔

اس کے قریب ہی سب سے چھوٹی بہن آ جو بیٹھی تھی۔ جیسے کسی سو کھے درخت سے ٹوٹی ہوئی شاخ ہو۔ اس کے چہرے پر اداسی برس رہی تھی۔ خدوخال سے ظاہر ہوتا تھا جیسے کوئی اپا بچ ہو۔ ہاتھ ٹنڈے سے تنھے۔ جیسے انگلیاں ٹوٹی ہوں۔ عمر بہت چھوٹی تھی لیکن چہرہ معصومیت سے خالی تھا۔

ان تینوں میں سے صرف راجوہی کو برداشت کیا جا سکتا تھا۔ لیکن پھر بھی جوانی کے سوا اس میں کیا تھا اور جوانی بھی وہ جو نسبتیت اور معصومیت سے یکسر خالی تھی۔ ایلی نے وہ نوٹ جیب سے نکال کر راجو کے سامنے رکھ دیا۔ ساجو نے نوٹ دیکھ کر سر اٹھایا اور پھر منہ بننا کر بیٹھ گئی۔

غلام محمد نوٹ دیکھ کر مسکرا یا بولا ”میرا حصہ رہی۔“

”تیرا حصہ۔“ راجو نے پیار بھری نظر اس کی طرف ڈالی اور پھر اپنی طرف یوں دیکھا جیسے اس کا حصہ سمجھا رہی ہو۔

”اور ہمارا نام ہی نہیں لیتا کوئی۔“ زمین پر بیٹھے ہوئے میلز مین نے اپنی چادر

اتار کر مسکرا کر کہا۔

”بڑا سیٹھے مارا ہے نا اس لئے۔“ ساجو نے ہاتھ چلا کر نفرت بھرے انداز میں کہا۔

دنلما ایلی کو یاد آیا ساجو۔ سفعی کی لٹ ساجو۔ سیٹھے گردھاری لال کی ساجو۔ اور اس نے پھرے غورے ساجو کی طرف دیکھا۔ کیا سیٹھے اس طرح کی واشتر رکھتے ہیں۔ جو عام لوگوں کے سامنے بیٹھنے سے نہیں گھبرا تی۔ پھر اس نے راجو کی طرف دیکھا۔ دولت پوری پناخہ راجو۔ اس کی دانست میں تو وہ چلا ہوا پناخہ تھی اور اس کی حرکات و سکنات۔ اس کا جی چایا کہ اٹھ کر رجھا گا لے اور صحن میں جا کر اس پڑھیا کے ساتھ مل کر چلا گئے۔

”میں اب جاتا ہوں۔“

”لے پان تو کھا جا۔“ ساجو نے بازاری انداز میں لکھا را۔

آجو کہم کر کوئے میں لگ گئی اور راجو مسکراتی ہوئی آگے بڑھی۔ ”یہاں آیا کہنا تیرا اپنا گھر ہے یہ۔“

باہر پڑھیا چیخ رہی تھی۔ ”حرام کاری کی لٹ پڑی ہے۔ انہیں خون چونے کا مزہ پڑ گیا ہے۔ جو نکیں ہیں جو نکیں۔“

نہ جانے پڑھیا کی بات نے ایلی پر کیا اثر کر دیا کہ گھر لوٹنے ہوئے تمام منظر ہی اس کی نگاہوں میں بدل ہوا تھا۔ دو کانوں پر بیٹھے ہوئے لالے یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے عکڑے شکار کی تاک میں بیٹھے ہوں۔ سودا بیچتے ہوئے بھاڑے چادر میں لپٹے ہوئے سیلز میں کی طرح مسکرا رہے تھے۔ تماش بینوں نے اپنی نگاہوں کے جال بچھار کئے تھے۔

پنوڑیوں کی دوکان پر مسکراتے ہوئے کھجاتے ہوئے انسان پلپے کیڑوں کی طرح ایک دوسرے کو اپنے لعاب دہن میں پھسوارہ ہے تھے۔ گھر میں علی احمد حساب

کے رجسٹروں کا خون چوں رہے تھے اور کھڑکی میں کھڑی شیمیم یوں حسرت سے ان ویران کوٹھوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جو چوبارے کے عقب میں صحراء کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ جیسے وہ اسی بات کی متنبی ہو کہ کوئی جونک اپنے ہونٹ اس پر گاڑ دے۔ اس کے سر پر آسمان نیلے بازو پھیلا لے ایک عظیم گدھ کی طرح چھایا ہوا تھا۔ ایلی محسوس کر رہا تھا جیسے وہ خود ایک جونک ہو جسے خون چو سنے کے لیے کسی جسم کی تلاش

ہو۔

جب ایلی کھر پہنچا تو بالآخر قبضت پھر وہ کاڑ باگھو لے بیٹھا تھا۔ ہاں بھائی صاحب یہ عمل ہے۔ چاندنی میں یہ بھرائج بدل جاتا ہے اور پھر بندرا اس کی چمک کو دیکھ کر اسے اٹھاتے ہیں۔ اس کے سفید مخملیں ہاتھ مغل کو یوں تھپک رہے تھے جیسے اس کی سرخی چوں رہے ہوں اور بالا کے فریب وہ باڑھی جونک اس کی چھپی بالا پر نگاہیں گاڑے بیٹھی تھی۔ کتنی عجیب تھی دنیا اور جو نکیں جو نکیں اور ارجام اور اردو گرد پھیلا ہوا چھایا ہوا ویران۔

پھر ایلی کی زندگی کے بھی انک جمود میں ایک حرکت پیدا ہوئی۔ اس کے ماں و زاد بھائی رفیق اور یوسف تارکا کام سکھنے کے لیے دو ماہ کے لیے دولت پور آ گئے۔ ان کے آنے سے ایلی کے لئے اس صحرائیں ایک چھوٹا سا نخلستان بن گیا۔

پکھا اور بھی

سینٹھ جمنا واس کے یتیم خانے میں ایلی دن گزارتا۔ جس کا نام کالج رکھ دیا گیا تھا۔ وہ شام کے وقت کالج سے سائیکل پر پاؤں مارتا ہوا کھر پہنچتا پھر رفیق اور یوسف کے ہمراہ بازاروں کے چکر کا ٹھا اور رات کو گھر آ کر پڑا رہتا۔ اب وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ دنیا صرف جونک ارجسم کے اجتماع کا نام نہ تھا وہاں جو نکلوں اور جسموں کے علاوہ اور بھی کچھ تھا۔ بنام سا کچھ جس میں پا کیزگی کی جھلک تھی۔ مثلاً رفیق اور یوسف مثلاً سامنے چوبارے میں دو بلوریں پاؤں چست پا جامہ یا وہ

سیاہ آنکھ جو بھی کھاران جنگلوں میں طلوع ہوتی تھی۔ جس کا مقصد نہ دیکھنا تھا
وکھانا جسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ حسین ہے کیف آور ہے اور چھپلکتی ہے۔ ایلی اسے
دیکھتا تھا یہ بتائے بغیر دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ اسے دیکھ رہا ہے اسے اپنے طرف مائل
کرنے کی کوشش کے بغیر دیکھتا تھا۔ اور پھر اس اضطراب سے بچنے کے لیے جو
اسے دیکھنے سے ایلی پر خاری ہو جاتا۔ وہ رفیق اور یوسف کو دیوانہ وار تلاش کرتا تھا۔
رفیق اور یوسف کے آنے سے اسے ایک نقصان بھی ہوا۔ انہوں نے ان
جانے میں ایلی کا علی احمد کے گھر سے رہا سہا تعلق بھی توڑ دیا۔
شام کو کھانے کے بعد وہ چپکے سے ایلی سے کہتے ایلی چلوڑ را گھوم آئیں۔ پہلی
مرتبہ جب انہوں نے ایلی گھونٹنے کی دعوت دی تھی تو اس کا بھی چاہتا تھا کہ انکا رکر
وے لیکن اپنی طبیعت کے خلاف وہ ان کے ساتھ چل پڑا تھا۔

گھونٹنے پھرنے کے بعد جب وہ بڑے ڈاک خانے کی طرف مڑے تو وہ
سوچنے لگا کہ ادھر جانے کا مطلب۔ وہ تو گھونٹنے کی جگہ نہ تھی۔ وہاں تو
بازار تھا۔ جہاں لوگ دیکھے جانا پسند نہیں کرتے۔

وہ ایک دو دھنگی دوکان پر رک گئے۔ ”دو دھنپو گے ایلی؟“ رفیق نے پوچھا۔
”نہیں۔“ ایلی نے لفی میں سر ہلا دیا۔

”اچھا بھی۔“ رفیق بولا۔ ”پویا نہ پوچھ رجا کر بتانا نہیں۔“

”اور بتا بھی دو گے تو کیا ہے۔“ یوسف اپنے سپاہیانہ انداز میں چلا یا۔ ”میرا تو
بھوک کے مارے دم نکلا جا رہا ہے۔“ النامیاں آدھ سیر دو دھنگی میں دو مکن۔“ اور وہ
دونوں اپنے اپنے پیالے لے کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر تک وہ چپ چاپ بیٹھے رہے۔
پھر رفیق نے یوسف کو اشارہ کیا۔

”تو بہے۔“ یوسف چلا یا۔ ”شمیم کے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹی کیسے کھا لیتے ہوتے
ایلی۔“

”اسی ہاتھ سے بچوں کو پوچھتی ہے اور اسی ہاتھ سے آٹے کا پیڑا اٹھا لیتی ہے۔“
رفیق نے آہ بھری۔

”اب کیا دو دھو بھی حرام کرو گے تم۔“ یوسف چلایا۔

اس کے بعد ایلی کے لئے بھی شیم کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا مشکل ہو گیا اور وہ تینوں
جھوٹ موت گھومنے پھر نے کا بہانہ کر کے رات کے اندر ہیرے میں پہلوان کی
دوکان پر جا کر دو دھو بن کھاتے اس وقت ایلی کے کان ملختی بازار پر لگے رہتے۔
جہاں سے ساری گلی کے سرگوشیت اور طبلے کی قہاپ کے ساتھ ساتھ ایلی کا دل دھک
دھک کرتا اور وہ حضرت نے ان جو باروں کی طرف دیکھا جہاں جانا اس کے لئے
ممنوع تھا اور جہاں جانے کی تمناء و تذہبہ زماں کے ول میں بڑھتی جا رہی تھی۔

سفر سارہ

رفیق اور یوسف کی ٹریننگ کلاس میں چار ایک عیسائی اڑ کے بھی تھے، جن سے
ان کی راہ و رسم تھی۔ خصوصاً کثر اور جان سے تو ان کی دوستی کی زیادہ تر وجہ یہ تھی کہ وہ
دولت پور کی عیسائی اڑ کیوں کی باتیں کیا کرتے تھے اور رفیق اڑ کیوں کی باتوں میں
دچکپی لیتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے وہ انہیں اکثر دو دھو پلانے کے لئے پہلوان کی
دوکان پر لے جالیا کرتے تھے۔

وکثر اور جان آتے ہی رومانس کی بات چھیڑ دیتے۔ ان کے نزدیک زندگی کا
مقصد صرف رومانس تھا اور انہیں اس لئے پیدا کیا گیا تھا کہ وہ روئے زمین پر
رومанс کا سلسلہ ختم نہ ہونے دیں۔ وکٹر مس بھاگو اور مس پھتو کا دیوانہ تھا جان کو مس
رجی مس چاند اور مس بالو کی لگن تھی اور وہ دونوں اس بات کے خواہش مند تھے کہ ہر
جان پہچان والے عیسائی احاطے میں لے جا کر اسے اپنی محبوباً کیں دکھائیں بلکہ ان
کو انہر و ڈیوس کرائیں۔

دوایک مرتبہ رفیق یوسف اور ایلی بھی عیسائی احاطے میں گئے تھے۔ انہوں نے

مس چاند بالا اور بجا گوکو وور سے دیکھا تھا اور مس پھتو سے ان کا تعارف بھی کرایا گیا تھا۔ ایلی کو عیسائی احاطے میں جا کر بے حد مایوسی ہوئی تھی وہ سمجھتا تھا کہ یہ میں اگر میموں کی سی نہیں تو ان کے لگ بھگ ضرور ہوں گی۔ لیکن رنگ کالا تھا۔ اور نقش بے حد بحدے تھے۔ شاید وہ ان تفصیلات کو نظر نہ ازگردیتا۔ لیکن ان کی آوازیں بے حد کرخت اور حرکات پھونڈتی تھیں۔ عیسائی احاطے کو دیکھ کر ایلی کو جان اور وکٹر کی باتوں میں قطعی طور پر دلچسپی نہ رہی۔ بلکہ اسے یوسف اور فیق پر غصہ آنے لگا۔

ایک روز وکٹر اور جان بھاگے بھاگے ان کے پاس آئے۔ آلتے ہی انہوں نے ایک شور برپا کر دیا۔ ”حد ہو گئی یا مر۔“ وکٹر چلایا۔
”اتنی ونڈر فل گرل آج تک دیکھنے میں نہیں آئی۔“ جان بولا۔
”بالکل میڈونا کا ساغھیں ہے۔“ وکٹر نے سینے پر ہاتھ رکھ کر آہ بھری۔
”اور پھر کس طرح آنکھیں اٹھا کر دیکھتی ہے۔ ہر فنی سی آنکھیں ہیں۔“ بے وچنگ آئز۔“ جان نے کہا۔

”لیکن نہ جانے کس ظالم نے اسے تباہ کر دیا اسے بچہ ہو گیا۔ یعنی پروفیل گیا اور اسے راہبہ بننا پڑا۔“ وکٹر نے آہ بھری۔ ”اگر وہ راہب خانے میں نہ ہوتی تو.....“

وہ دونوں اس نئی راہبہ کیتھی کے لئے پاگل ہو رہے تھے۔
کئی ایک دن تک وہ کیتھی کے سوا کوئی مذکورہ نہ کر سکے رفیق اور یوسف کا اشتیاق بڑھتا گیا حتیٰ کہ یہ کیفیت ہو گئی کہ وہ خود کیتھی کا مذکورہ چھیڑ دیتے۔
نہ جانے کیتھی کیسی ہو گی۔ ایلی سوچتا اسے یقین نہ آتا تھا کہ وہ اتنی خوبصورت ہو گی۔ بہر حال ایلی ان کی باتیں سناتا۔ کیتھی کو دیکھنے کا شوق رفیق کے دل میں اس قدر بڑھ گیا کہ اس نے ایک روز صاف کہہ دیا۔ ”یارہمیں بھی دکھاؤ۔“
ایلی کو اس بات پر بہت غصہ آیا۔ بڑا عاشق مزاج تو دیکھو۔

”ویکھ لیں گے کیا حرج ہے۔“ یوسف بولا۔

”لیکن کیافا مددہ۔“ وکٹر چلا میا۔ ”خالی دیکھنے سے کیافا مددہ۔“

”وہ تو ایک ایقہر میل چیز ہے۔ ایقہر میل“ جان آئیں بھرتا۔

”کیا واقعی۔“ رفیق اور یوسف جیرانی کے پوچھتے۔

”وہ تو جیسے میڈونا کی جستی جا گئی مورت ہے۔“ وکٹر چلاتا۔

”ہائے میں کیا کروں۔“ جان آہ بھرتا۔ ”وہ تو کسی کی طرف دیکھتی نہیں۔ مسکاتی نہیں۔ بات نہیں کہتی بیچاری بری دیکھی ہے۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھری رہتی ہیں۔“

”بھی چاہتا ہے۔ جس نے کیتھی کو خراب کیا ہے اسے جان سے مار دوں۔“ وکٹر گھونسا چلاتا۔ ”بیچاری کو بچہ ہو گیا۔ اس نے راہبہ بننا پڑا۔ ورنہ روہب خانے میں نہ ہوتی تو ہم اس سے ملا کرتے۔ بس پروف وے دیا۔ ورنہ۔“

پھر ایک روز جان اور وکٹر کے اصرار پر رفیق یوسف اور ایلی کیتھی کو دیکھنے کے لئے گرجا گھر گئے۔ اس روز رفیق کی آنکھوں میں گلابی بوندیاں اڑ رہی تھیں۔ یوسف کچھ زیادہ ہی قلاں پیس بھر رہا تھا اور ایلی کے دل میں کچھ کچھ ہو رہا تھا۔ گرجے میں تجوم تھا۔ عیسائی احاطے کے نوجوان آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر راہب خانے کے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ عیسائی لڑکیاں ناک بھوں چڑھا رہی تھیں۔ بوڑھا پا دری ورز دیدہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

دفعاً راہب خانے کا دروازہ کھلا۔ مجمع پر سکوت طاری ہو گیا۔ سات راہب لڑکیاں نگاہیں جھکائے گرجے میں داخل ہو گئیں۔ ”وہ ہے وہ۔“ جان نے دلبی آواز میں کہا۔ جوانوں کی بھوکی نگاہیں آخری لڑکی پر مرکوز ہو گئیں۔ اس کے نقوش ستواں تھے۔ چہرہ ستا ہوا تھا۔ ہونٹوں سے اداکی ٹپک رہی تھی۔ شانے جھکے ہوئے تھے۔ سر لٹکا ہوا تھا اور وہ آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھی۔

”ہائیں“، ”فعتار فیق کی چیخ سی نکل گئی اور وہ حسب دستور ”سی سی“ کرنے لگا جیسے کہ اس کی عادت تھی۔ ایلی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ادھر سے یوسف زیرِ لب چلا یا۔ ”وہی تو ہے یہ سارہ۔ سارا۔ ایلی۔“ ایلی نے غور سے کیچھی کی طرف دیکھا۔ سارا کی آنکھوں سے روآنگو گاؤں پر ڈھلک آئے۔ پھر اس نے سر جھکا لیا۔ سڑنے آ کر اپنے تھام لیا۔

اندھا کنوال

پھر گرمی کی تعطیلات گی وجہ سے کانج بند ہو گیا۔ یوسف اور رفیق کی ٹریننگ بھی ختم ہو چکی تھی۔ علی احمد سے اجازات لے کر ایلی رفیق اور یوسف کے ساتھ علی پور آ گیا۔

گرمی کی چھپیوں میں محلے کی زندگی میں ایک عجیب و غریب گہما گہمی پیدا ہو جاتی تھی۔ محلے کے ملازم پیشہ لوگ انہی دنوں چھٹی لے کر آیا کرتے تھے تا کہ محلے والوں سے میل ملا پ قائم رہے۔ اگر وہ خود چھٹی پر نہ آ سکتے تو وہ ایک ماہ کے لئے بچوں کو ضرور علی پور بھیج دیتے۔ اتنی دیر بہر رہنے کے بعد عورتیں نرالی سچ دھج کے ساتھ علی پور میں داخل ہوتیں اور اپنے نئے حاصل کردہ فیشن اور خیالات کو اک شان سے محلے کے عوام کے سامنے پیش کرتیں۔ اپنی عظمت کا رعب ڈالنے کی کوشش کرتیں۔

”نہ بہن بچے کو ڈرایا نہیں کرتے اس طرح بچے کے دل میں ڈر بیٹھ جاتا ہے۔
ہاں میں تو پیٹ لیتی ہوں۔ اپنے سیدی کو لیکن ڈرانا۔ اونہوں!“

دوسری بار تھی نہ بہن یہ چمکدار سامنے نہ چلے گی اس شلووار کے ساتھ۔ اب تو بہن چمکدار چیز کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ میں نے جبھی بوسکی کی قمیصیں سلوالی ہیں۔

جو ان لڑکیاں کھڑکیوں میں کھڑی ہو کر محلے کی کھڑکیوں کے سامنے اپنے لباس کی نمائش کرتیں۔ لڑکے اپنے دوستوں سے مل کر نئی سیکھی ہوئی باتوں کا ریکارڈ چلاتے۔

محلے کے بوڑھے ان کی باتیں سن کر مسکراتے جیسے پاگل خانے سے چھوٹ کر آئے ہوں پھر وہ کھنکارتے اور زیر لب لا حول پڑتے ہوئے مسجد کا رخ کرتے۔

بوڑھیاں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادگر دیکھتیں اور پھر ”تو بہے کیا زمانہ آیا ہے“ کہتی ہوئیں اپنے اپنے کام میں لگ جاتیں۔

محلے کی جوان اڑکیاں حسرت بھری نگاہوں سے ان نوواروں کی طرف دیکھتیں۔ ان کا جی چاہتا کہ باتیں کرتی رہیں اور وہ سنتی رہیں۔ ان کی آنکھوں میں گویا شوق کے دیے روشن ہو جاتے۔

اس لحاظ سے محلہ ہر سال موسم گرم میں بیکھلی بلایا کرتا تھا۔ جس طرح خزان میں درخت پرانے پتے گولے ہیتے ہیں اور نیا نہر جامد اور ہٹلتے ہیں۔ اس کے باوجود آ صفائی محلے کی زندگی بنیادی طور پر ویسے ہی اپنے صدیوں پرانے محور پر گھومتی رہتی محلے میں تبدیلی آتی تو تھی۔ لیکن کچھواچال سے کسی کیڑے کے رینگنے کے متراوف تھی۔ درحقیقت اپنی مخصوص کہنہ کج رفتاری کی وجہ سے وہ محلہ لوگوں کو پیارا تھا۔ چونکہ وہاں جا کر وہ اپنے عظمت جتسکتے تھے۔ نئے حاصل شدہ خیالات سے محلے والوں کو مستفید کرنے کے عمل میں یہ خوش نہیں دل میں رچاسکتے تھے کہ وہ نئے خیالات سے کما حقہ واقف ہیں۔ درحقیقت آ صفائی محلہ وہ اندھا کنوں تھا۔ جہاں کوئی سمندری مینڈک داخل نہ ہوا تھا۔ جہاں جو ہڑکے مینڈک پھد کتے تھے اور وہ بھی اس قدر نہ پھولے تھے کہ اپنے آپ میں نہ سامسکیں۔

سٹیشن کے قریب انہیں رضامیں گیا۔ ”بھی وہ۔“ وہ چلایا۔ ”آ گئے جناب۔ بھی کیوں نہ آتے۔ اب بھی نہ آتے تو کب آتے ساون آیا اور مینڈک نہ ٹرائیں۔“

یہ کہہ کروہ ایلی سے بات کئے بغیر لاثھ گھماتا ہوا کچھری کی طرف چل پڑا۔ ابھی آتا ہوں ذرا کچھری جانا ہے۔“ وہ کھٹ کھٹ چلتے ہوئے چلایا۔ ”ہوگی ملاقات

دوکان پر۔“

برساتی نالے کے پل پر انہیں چچا عماو ملے۔ ”ہوں۔“ انہوں نے آنکھیں چمکاتے ہوئے کہا ”آگئی یہ بھن منڈل۔ چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ کب سے مندر میں گھنٹیاں نج رہی تھیں۔“ یہ بھر کر زیر لب لا گول پڑھتے ہوئے وہ شیشیں کی طرف چل دیئے۔

”اس اللہ لوگ کو مندر کی گھنٹیوں کی کیا سوچھی۔“ ایلی نے رفیق سے کہا۔

”بس جو منہ میں آیا چلا دیا۔“ یوسف نے بے پرواںی سے کہا۔

”کوئی بات ضرور ہے؟“ رفیق اپنے بھلکے بھلکے انداز میں بولا۔

چورا ہے کے قریب پچھی اماں کو دیکھ کر ایلی نے جھک کر سلام کیا۔ ”جیتے رہو۔“

وہ بولی ”چھٹی پر آئے ہونا۔ اچھا ہے۔ اچھا کیا۔ دیکھ لو تم بھی روشن چاردن کے لئے دن ہیں تمہارے۔“

چھٹی اماں کی بات سن کر ان کا ما تھاٹھن کا ضرور کوئی بات ہے۔ نہ جانے کیا ہے۔

مگر ہے ضرور جھجھی تو وہ سب اشارتاً انہیں سمجھا رہے تھے کچھ رفیق بھی گھبرا گیا۔ لیکن یوسف تھقہے مار کر بہت سارہا۔ ”ارے یا رخواہ مخواہ ڈرتے ہو۔“

ڈیورٹی میں ارجمند نے اسے پکڑ لیا۔ ”ارے تم ہوا یا تم۔ ارے پٹ گئے۔ تباہ ہو گئے۔ بر باد ہو گئے۔“ پھر اس نے رفیق اور یوسف کو دیکھا اور دفعتاً پہلو بدلا۔ پہلو بدلنے میں ارجمند کو کمال حاصل تھا۔

”السلام علیکم بھائی صاحب مزادج اچھے ہیں صاحب اپنا حال تو تباہ ہو رہا ہے اس ایلی کے بغیر کم بخخت منہ موڑتا ہے تو پھر ادھر دیکھنے کا نام ہی نہیں لیتا اور فرمائیے آپ تو خیریت سے ہیں نا۔“

رفیق مسکرا کر آگے کو چل دیا۔ تو ارجمند نے ایلی کو رکنے کا اشارہ کیا۔ ”ابے بھر بے۔ ہم سے ملے بغیر دادی اماں کی جھوپی میں کیسے جا سکے گا تو۔“

رفیق اور یوسف کے جانے کے بعد ارجمند نے اپنے سینے پر دو ہتھ مارنے شروع کر دیئے۔ ”تاہی بربادی تباہی بربادی۔ امرے یا روہ سارا ایٹھ امحر کا دفتر بے معنی ہو کر رہ گیا وہ انگریزی خاک میں مل گیا اور یہ پریم ٹونا اور پریم پھر ریا۔ اس نے اپنی بانسری اور رشیمیں رومال کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”سب فیل“ وہ تو نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتی تھے جانے وہ ناگ کس بین پر مست ہو گا۔ امرے ارے کوئی ناگ سا ناگ ہے۔ اف، اف، اف کی پھین ہے۔ کیا دم خم ہے۔ کیا حم طراق ہے۔ ایک نگاہ دیکھ لے تو دن بھر سرو نہیں جاتا۔ اور سانور ارٹ جیسی گول کا کہیا ہو۔ اب بولو وہاں اس خاک سار کی بانسری کیا کر دیتی ہے۔ بیچاری، ”آخر بات بھی کرو گے۔“

ایلی نے جمل کر پوچھا۔

”لو بھی۔“ ارجمند نے سر پیٹ لیا۔ ”اور یہ کیا کواس کر رہا ہوں۔ میاں دیکھو گے تو ہوش اڑ جائیں گے وہ چیز ہے جو دیکھے بنا تصور میں نہیں لائی جاسکتی۔ اللہ اللہ کیا چیز ہے۔ خدا کی قسم اس مسجد پر ایک۔۔۔ بھر پور نگاہ ڈال دے تو ایک آن میں سالی آپ تی بنت جائے۔ لو کر لو جو کرنا ہے۔ ہئے۔ ہئے۔“

ضیا کو آتے ہوئے دیکھ کر ارجمند ایک ساعت کے لیے خاموش ہو گیا۔ ”لو بھی۔“ وہ زیریب بولا۔ ”آگئی۔“ تھنڈا الائیں الہذا اپنی گاڑی رک گئی۔“

”اپن کی تو میں لائیں ہے بھائی۔ سید ہے روٹ پر چلانا جانتے ہیں ہم۔ ہمیں تو حوروں سے واسطہ ہے غلاموں کی بات۔ تھنڈا الائیں سے پوچھو۔“ ضیا حسب معمول آنکھوں میں مسکرانے لگا۔ ”ان کی پانچوں گھنی میں ہیں آج کل۔“ ارجمند بولا۔ اور ہمارا سر کڑھائی میں ہے۔“

”کیوں بھی یہ ٹھیک کہتا ہے ارجمند۔“ ایلی نے بات سمجھے بغیر ضیا سے پوچھا۔ ”بکتا ہے۔“ ضیا ہنسا۔ ”وہ تو میرا بھائی بن گیا ہے۔ ایمان سے۔“ اور پھر

چوگان کی طرف چل پڑا۔

”ہے۔“ ارجمند نے چھاتی پر ہاتھ مارا۔ ”وہ ہماری بہن ہی بن جاتی۔“ وہ ضیا کی طرف دیکھ کر چلا یا۔ پھر ایلی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”اچھا بیٹا تو جاؤ دادی اماں کے چون چھواؤ۔ خاکسار پنجی خوبیاں کی لائیں کئے نیچے ڈیوٹی دے رہا ہو گا۔ دادی اماں کے بنے ہوئے لذوکھانے نہ بیٹھ جانا ورنہ خاکسار کی آہ پرے گی تم پر۔“

ایلی کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ آخر وہ کون تھی اور وہ کون تھا اور محلے والوں کے اوس ان کیوں خطابوں نے تھے ارجمند اور ضیا کی تو اور بات تھی مگر پچھی اماں اور پچا عمامہ ظاہر تھا کہ پچا عمامہ بھی متاثر ہوئے بغیر شدہ تھے۔ ایسا کون تھا وہ۔

چوگان میں پہنچ کر اس نے ڈرتے ہوئے چاروں طرف دیکھا مگر محلے والوں کے سوا وہاں کوئی نہ تھا اور محلے والیاں حسب وستورا سے دعا میں دے رہی تھیں۔

”اللہ یا امریتہ نصیب کرے۔———

”کون آیا ہے چاچی۔“

”اے ہے اپنا ایلی آیا ہے۔“

”جیتا رہے بی بی ماں کے کلیج کی ٹھنڈک ہے۔“

ڈیورٹی میں جا کر وہ ڈر گیا اس کے سامنے مذہبیں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ”تم آ گئے۔ اب چلے نہ جانا۔“

”ہائے کون ہے؟“ دادی اماں چلائی۔ ”دیکھ تو سیڑھیوں میں اڑکی جیسے کسی کی پٹائی ہو رہی ہو۔ ہائیں ایلی تو ہے۔ تو نے تو مجھے ڈراہی دیا۔ کیا ایسے چڑھا کرتے ہیں سیڑھیاں۔ کب آیا تو۔ راضی تو رہانا۔ علی احمد کیسا ہے۔ بچے کیسے ہیں۔ وہ خود نہیں آیا چھٹیاں کب ہوں گی اسے؟“

سعیدہ اسی طرح گھننوں میں سردیسے دادی اماں کے پاس پہنچی تھی۔ ”اماں سے ملا تو،“ دادی اماں نے کہا۔ ”وہ ادھر رہتی ہے۔ فرحت کے پاس۔ اچھا مل لجو جا

کر ذرا بیٹھو۔ اب تو اتنا بڑا ہو گیا ہے تو منہ پر داری کی نکل رہی ہے۔“ دادی اماں نے
حیرانی سے اس کا جائزہ لیا۔ ” یوں کیا کھائے گا۔ تیرے لئے بہت کچھ رکھا ہوا ہے۔
میں نے ہاں۔ اے حمیدہ رشیدہ لڑکیوں تم کیا دیکھ رہی ہو۔ جاؤ اپنا کام کرو۔“ وہ ان دو
لڑکیوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگی جو دروازے میں کھڑی غور سے ایلی کی طرف دیکھے
رہی تھیں۔

رشیدہ اور حمیدہ سیدہ کی بہن نیاز کی بیکیاں تھیں۔ ان کی والدہ فوت ہو چکی تھی اور
اب وہ دونوں دادی اماں کے پاس آ گئی تھیں۔ ” جا رشیدہ جا کروہ کمرہ صاف کر
وے۔ حمیدہ تجھے تو بہت کام ہے ابھی برتن مانجھنے میں۔“

” اچھا ایلی۔“ دادی اماں بولی۔ ” علی احمد نے میرا خرچ نہ بھیجا۔ کیا اسے خود
خیال نہیں آتا۔ اے ہے میں کیوں یاد کروں خدا نہ کرے۔ مجھے کوئی بے اعتباری
ہے۔“ ایلی نے بڑھ کر دادی اماں کو گود میں لے لیا۔ ” اے ہے چھوڑ۔“ وہ چلائی۔
” جیسے کوئی دس سال کی بچی ہو تو میری بڈیاں توڑے گا تو بہے۔ دیکھتے دیکھتے
کتنے بڑے ہو جاتے ہیں یہ ہاتھوں کے جنے۔ اچھا تو کوئی اور بات سن۔ وہاں کیسے
رہتا ہے تو۔“ وہ بولے جا رہی تھی اور ایلی سوچ رہا تھا کتنی پیاری ہے۔ دادی اماں۔
اس کے پاس آ کریوں لگتا ہے کہ جیسے بچہ گھونسلے میں آ گیا ہو۔ دادی اماں کے پاس
جا کروہ بھول جاتا کہ ارجمند کچی حویلی میں اس کا انتظار کر رہا ہے اور وہ کون تھا جسے
ضیا نے بھائی بنالیا ہے۔ وہ سانوری کون ہے جو کسی بین پر مست نہیں ہوتی۔

بیگم

نہ جانے وہ کب تک دادی اماں کی بڈیوں سے چھٹ کر بیٹھا رہا تھا کہ ہاجرہ آ
گئی۔

” ایلی آیا ہے۔“ ہاجرہ کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ ” ایلی آ فرحت تیرا انتظار کر رہی
ہے۔“

”جامع آ۔“ دادی اماں بولی۔ اور وہ اٹھ کر اماں کے ساتھ فرحت کی طرف چل

ابھی وہ فرحت سے بات کرنے ہی لگا تھا کہ اوپر کی میری ہیوں میں شور ہوا۔ ”سنا ہے ایلی آیا ہے۔“ شہزادی کی آواز دوسرے گونجی۔ شہزادی کی آواز کی سرتال ہی نرالی تھی۔ اس کا ہر انداز محلے والیوں سے مختلف تھا۔ ایلی نے شوق سے میری ہیوں کی طرف دیکھا۔ سامنے شہزاد کھڑی مسکرا رہی تھی۔ مونگیا گھڑی کے پٹ پورے طور پر کھل چکے تھے۔

شہزادی کی ہر بات میں غورت اور لڑکی کی عجیب و غریب آمیزش تھی۔ ایسی آمیزش جو محلے کی کسی عورت یا لڑکی میں نہ تھی۔ شہزاد میں بچپن کی ایک ایسی جھلک تھی جو دوسروں کو کھینچنے پر اکساتی تھی۔

ایلی نے شہزاد کو دیکھ کر سر جھکایا۔ ”جی ہاں۔“ وہ بولا۔ شہزاد کے روپ و اس کے جسم و روح کا روپ جی ہاں کہہ کر سر جھکایا کرتا تھا۔

”وہ بلاتے ہیں تم کو چائے پر۔“ شہزاد مسکرائی۔ ”چلو میرے ساتھ۔“ اور ایلی چپ چاپ اس کے ساتھ ہو لیا۔

”تم آ گئے،“ شریف اسے دیکھ کر مسکرا یا۔ اس کی آنکھیں اسی طرح چھپت پہنچیں۔ البتہ ہونٹوں پر ہلاکا ساتھیم تھا۔ ایلی کی نگاہ میں شریف کس قدر خوش نصیب تھا۔ جسے شہزاد نے اپنایا تھا۔ جس کی زندگی شہزاد کی روشنی سے منور تھی۔ لیکن بظاہر شریف پر اس کا کوئی اثر نہ تھا۔ وہ اب بھی انور کے خیال میں ویسے ہی مست رہتا تھا۔ کتنا وفا شعار سچا عاشق ہے۔ اس کی محبت کو کوئی چیز متعازل نہیں کر سکتی۔ جس کی زندگی میں شہزادی مونگیا گھڑی کھل کر بھی کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکی۔

”ہوں تم کیسے ہوا یلی۔“ ایک باوقار حسین عورت اس کے روپ و آکھڑی ہوئی۔ ایلی اسے دیکھ کر گھبرا گیا۔ ”سلام کہتا ہوں۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔

”یہ ایلی ہے اماں۔“ شہزادے اس عورت سے کہا۔

”مجھے یاد ہے۔“ وہ بولی۔ ”مرات کے دن اندر آیا تھا۔ وہی تو ہے۔“ ایلی نے اس کی طرف ڈرتے ہوئے دیکھا۔ اونچا المباقہ۔ فربہ جسم اور پوتا رچہرہ۔ اس کے خدوخال میں حسن و وقار کی عجیب آمیزش تھی۔ آنکھوں میں حکومت کی چمک تھی۔ آواز میں دبدبہ تھا۔ اس کی انگلیوں میں عجیب قسم کی انگلوٹھیاں تھیں۔ جن میں نگ کلی کی طرح ابھرے ہوئے تھے۔

”بیٹھ جاؤ۔“ اس نے گویا ایلی کوٹھا۔ ”سن۔ تیرے باپ کا کیا حال ہے۔ اب تو کشمیر کے سبب ہے چڑیا ہو گا۔ اس کا دل کوئی نویلی چھٹی ہے نگاہ میں۔“

”بھی بھی۔“ ایلی ہان سوچ چھے کہے جا رہا تھا۔ لیکن اس کا بھی چاہتا تھا وہ اس کے روپ و بیٹھار ہے اور انھیوں سے اس کی طرف دیکھا رہے۔ اس وقت وہ شہزادو کو بھی بھول چکا تھا۔ اور شریف تو بالکل ہی ذہن سے اتر چکا تھا۔

پھر محققہ کرے سے کسی نے آواز دی اور بیگم بولی۔ ”پھر انھیوں گی کسی وقت تیرے پاس۔“ یہ کہہ کر وہ چلی گئی اور طلسہ ٹوٹ گیا۔

ملحقہ کرے سے شہزادی کی کئی ایک آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور وہ محسوس کر رہا تھا۔ جیسے چمن میں بہار آگئی ہو۔ لیکن وہ چمن ایلی کے لئے منوع تھا۔ منوع نہ بھی ہوتا تو بھی اس کی جرات نہ ہوتی کہ وہاں جا کر دیکھتا کہ وہ آوازیں کن کی تھیں۔ جرات ہوتی بھی کیسے۔ اس میں کوئی بھی خوبی نہ تھی۔ چہرہ کا رُون سا تھا۔ جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ دکھائی دیتا تھا۔ رنگ کالا تھا۔ کوئی بھی تو ایسی خصوصیت نہ تھی جس کے بل بوتے پر وہ اپنے آپ کو درخور اعتنا سمجھتا۔ امید رچاتا اور جرأت کو کام میں لاتا۔

سامنے شریف لیٹا ہوانہ جانے کیا کہہ رہا تھا۔ وہ اپنے ہی دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ نگاہیں ماضی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اسے یہ احساس نہ تھا کہ ایلی دنیا میں کھویا ہوا

ہے۔ اور اس کی بات نہیں سن رہا۔ اسے اس سے غرض نہ تھی کہ کوئی اس کی بات سنے۔ اسے تو کہنے سے غرض تھی اور بات کہنے کے لئے اس نے ایلی کو چن لیا تھا اور ایلی سننے کا انداز قائم کئے کچھ سوچ رہا تھا۔ اسے خود بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے کیا محسوس کر رہا ہے۔ اپنے محسوسات کو پانکے شاید اسے نہ امتحان کر دیں اس لئے اس نے اپنے محسوسات کو واضح طور پر کبھی نہ پانیا تھا اور قریب ہی کسی چمن میں رکھ دیا۔ اس کی وجہ سے دوسری کی وجہ سے اس کے نیچے انگر اینڈی کا شیدائی پریم سند لیں تھے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

کار اور خاکسار

اگلے روز صبح سوریے ہی ارجمند آگیا۔ اور پریم کے چلے۔ وہ آتے ہی چلا یا۔ ”کل سارا دن مجھے کبھی حولی کے سحر میں پیاسا مارا اور خود گوگل کے بن میں سانوری سے سانوری سے رنگ پچکاری کھیلنے میں مصروف رہا۔ لف ہے تیری دوستی پر۔“

جب ایلی نے سانوری کے متعلق اپنی علمی کا اظہار کیا تو ارجمند قہقہہ مار کر نہیں پڑا۔ ”ہمیں بناتا ہے یا رہمیں جنہوں نے پریم دویا پر بالپن ہی میں عبور حاصل کر لیا تھا۔ اپن وہ ہیں جنہوں نے پانی پت کی ڈپنسری کی میزوں پر پیٹیکل ٹرینگ حاصل کی ہوئی ہے۔ کہو تو سندوکھادیں۔ سندیافت لوگوں کو چکلیوں میں اڑانا آسان نہیں۔ اچھا تو پیٹھا کل کی رپورٹ دو۔ کونے مرافقے کر لئے اور کون کون سے باقی ہیں۔ لیکن یا رکیا رنگ ہے کیا انداز پایا ہے۔ اور پھر ماشا اللہ حساس اور سمجھدار۔ ہلکی سی جنبش بھی نوٹ کے بغیر نہیں رہتی۔ رومال کی ہلکی سی جنبش کی یوں۔ مطلب خاکسارا بھی حاضر ہوا۔ فوراً بات پالی لیکن کیا مجال کہ چتوں سے ظاہر ہو۔ صرف ایک لطیف مسکراہٹ اور پھر فوراً جتا بھی دیا۔ ہم سمجھ گئے۔ خاکسار ہو آئے اجازت ہے جب تک ہمیں چوگان سے کوئی چھپی نہیں۔ اور پھر چوگان سے کوئی چھپی نہیں۔“

اور پھر چوگان سے منہ موڑ کر کھڑے ہو گئے اور جب تک خاکسار واپس نہ آیا ویسے ہی کھڑے رہے۔ واہ واہ کیا ذہانت ہے۔ جتنی بڑی بے پرواہ ہے۔ اتنی ہی چھوٹی حساس ہے۔ واہ واہ اپنا انگرازی وہ چلا ہے کہ نہ کیا بتاؤں۔“ وہ رک گیا۔

”لیکن سب بیکار ہے“ اس نے پینتھرا بولा۔ ”سب بیکار انگرازی کا ہوش بھی رہا ہو۔ کس کافر کو ہوش رہے گا۔ میں کب تک مجھلی کانٹے پر لگی رٹپی رہے اب تو وقت ہے کہ سر کارڈوری کھینچیں۔ لیکن سر کار بھی کیا کریں یہی وہ تو خود مہمان کی حیثیت سے آئے ہوئے ہیں وہ کیسے کھینچیں اور خاکسار کے لئے یہ رنگ محل منوع ہوا۔ وہاں جائے تو اس بہانے جائے اسی فکر میں تھا خاکسار کہ اللہ نے رحمت کا فرشتہ بھیج دیا یعنی تم آگئے اور تم یہاں پہنچتے ہی پڑیں میں کروڑہ گئے۔ ہے ہے۔“

سانورے کہیا

”ہاہااا“، فقط ارجمند چیخ کر بولا۔ ”تم اپنی رام کہانی میں لگے ہیں اور وہ دیکھو وہ۔ اس کھڑکی میں ارے اندھے وہ والی جواندھیری ڈیورٹھی کے اوپر کھلتی ہے۔ نہ جانے سانورے کہیا کب سے اپنی گوپیوں کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ اے ٹھہر تو۔ اتنا بے صبر کیوں ہوا جا رہا ہے۔ مجھے پرnam تو کر لینے دے۔“ اور وہ درشن کے بن ترس گئی اکھیاں گلگنانے اور رومال ہلانے لگا۔

کھڑکی میں ایک اوپنجی لمبی اڑکی لمبی لمبی پلکوں سے سیادہ خوابیدہ آنکھوں کو ڈھانپے کھڑی تھی۔ اس کے نقوش ستواں تھے۔ چہرے پر انوکھی اسی ریشمیں ماحتوں کا شفاف سانقاب پڑا تھا۔ جیسے کوئی سندھیا با تھوڑی میں شیشے کا سلپر لئے جیراں کھڑی ہو۔ ”لیکن یہ ہے کون؟“ ایلی چلا یا۔

”کیا واقعی۔“ ارجمند نے جیراں سے ایلی کی طرف دیکھا۔ ”تم تو سمجھ رہے تھے کہ بنا رہا ہے ہمیں۔ ارے بھائی یہ سب تمہاری اس مونگیا گٹھڑی سے نکلے ہوئے فتتے ہیں۔ جب سے وہ پنڈورا یہاں آئی ہے۔ نگین مصیبتوں کا ایک صندوق کھل گیا۔

ہے۔ اب کرو جو کرنا ہے اور ابھی دیکھا گیا ہے ابھی تو وہ گلاب کا پھول اور رس گلا بھی ہیں۔ اف! وہ گلاب کی کلی جب کھلنے لگی تو دنیا پر رنگ کی وہ قیامت ٹوٹے گی کہ آنکھیں پھٹ جائیں گی۔ چھ سال کی عمر میں یہ کیفیت ہے کہ مسکراتی ہے تو فضا میں قند میں روشن ہو جاتی ہیں اور وہ ان کا بھائی شوکت جیسے موسم کا پتلہ ہو۔ ضیا تو اسے دیکھ کر ہمیشہ کے لیے بدمعاشی سے توبہ کر چکا ہے اور جمیل پیرے کھانے کے شغل کو بھول چکا ہے خیر اپنے کو تو بخندلان سے کوئی دچکپی نہیں۔ اپن کو تو باری یہ سانورے کنھیا لے ڈالے اور حضور گاتے جھی ہیں واہ واکیا کاتے ہیں۔ چار دیک دن ہوئے سمجھن منڈلی میں برآ جمان ہوتے تھے۔ وہ رنگ بھلایا کہ بس کیا پوچھتے ہو۔ محلے کے رُکوں کے دل کا نوں نہیں منتقل ہو گئے اور نہ صعونت نہ وہ تال دی کہ بس اے ہے۔“
وہ چھاتی پر دو ہزار نے لگا۔

عین اس وقت سیر ہمیوں سے پاؤں کی چاپ سنائی دی جیسے کوئی نیزے پر ناج رہا اور پھر چشم سے شہرا د داخل ہوئی۔ اس کا سانس چڑھا ہوا تھا۔ دو پٹہ کندھوں پر اڑ رہا تھا۔ منہ پر سرخی جھلما رہی تھی۔ ”ا میلی ایلی۔“ وہ بولی۔ ”سب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ چائے سامنے رکھے چلو۔ جلدی آؤ۔“ یہ کہہ کر وہ واپس دوڑ گئی۔
ار جمند از سر نوسر پیٹنے لگا۔ ”بائے اللہ کی کریں ہم کو ہر جائیں ہمیں کوئی نہیں بلاتا چائے پر کوئی پوچھتا ہی نہیں کہ میاں کون ہو۔ سیر ہو یا پاؤ ہو۔ اچھا بھی جاؤ۔ مزے اڑاؤ۔ اپن کا کیا ہے۔ جیسے تیسے وقت بتا لیں گے بس یہی فرق ہے نا کہ تم سنگ ساتھی ہو اور ہم پر دیسی۔ پر یاد رکھو ووست۔ سنگ ساتھی کو کبھی وہ رتبہ نہیں ملا جو پر دیسی کو ملتا ہے۔ آخر میں بازی پر دیسی ہی کے ہاتھ میں رہتی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے حریفانہ سلوٹ مارا اور چلا گیا۔

اس کے بعد یہ معمول ہو گیا۔ روز صح سویرے چائے کے لیے شریف کی طرف سے بلاوا آتا۔ پہلے فضا میں گلگرو بجھتے پھر چشم سے شہرا د اتر آتی۔ دو پٹہ اس کے

شانوں پر یوں لکھتا جیسے کسی ہوائی ڈاک کا اشتہار ہو۔ بانیمیں فضا میں لہرا تیں جیسے رفتار ظاہر کرنے کے لئے مصور نے گلابی خطوط لگا دیئے ہوں۔ ”وہ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ وہ هنسنے گھنٹیاں بھنتیں۔

چانے پر شریف اسی طرح حچپت پر نگایں گاڑے رہتا اور ہر دو منٹ کے بعد ایک لمبی آہ بھرتا اور پھر جوش میں دلبی آواز سے کہتا۔ ”کسی سے محبت کرو ایں۔ چاہے وہ کوئی بھی ہو بس محبت کرو۔“

دو پھر کو جیل شوکت کو بالا لاتا ہے۔ وہ تینوں بر ساتی میں بیٹھ کر پیس اڑاتے۔ جس کے دوران میں ایلی اس آئینے کی طرف دیکھا رہتا جو جیل نے ایسے زاویے پر لگا رکھا تھا کیچھ سے آتا ہوا ہر خس پیلے ہی نظر آجائے۔

جمیل شوکت سے با توں میں مشغول رہتا۔ شوکت نہایت معصومیت سے جیل کی طرف دیکھتا اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ روزا سے اتنی مٹھائی کیوں کھلاتا ہے اور ایلی اس آئینے پر کیوں جھکا رہتا ہے۔

دو پھر کے وقت شہزادی والدہ آ جاتی جسے سب بیگم کہتے تھے اور وہ تھی بھی تو بیگ، ایلی اکثر محسوس کرتا تھا کہ اس کے سر پر چھونا ساتھ بھی ہونا چاہیے تھا۔ جیسے بیگمات پہنچتی ہیں۔ اس کے انداز میں بلا کار عرب تھا اور اس کی نگاہوں میں ایک عجیب شان بے نیازی تھی۔

بیگم کو آ صفائی محلہ بالکل ناپسند تھا۔ یہ کیا ہیں تمہارے محلے کے مکانات۔“ وہ ایلی سے کہتی ”امدھیرے کو نے اجڑے ہوئے چوبارے جیسے گلی سڑی پیاز کے چھلکے ہوں ایک دوسرے کے اوپر۔ دوسرا تیرے کے اوپر تو پہ ہے ہمارے یہاں تو صاف سترے کمرے ہوتے ہیں اور شہزادی کے ابا۔ تو ایک دن بھی نہ ٹھہریں یہاں بڑے صفائی پسند ہیں وہ اور یہ جو تمہاری محلہ والا یا پکاتی ہیں۔ جسے تم لوگ کھانا کہتے ہو۔ ان کے سامنے رکھا جائے تو طوفان اٹھادیں۔ تمہارے محلے کے مردوں بدھوئیں بدھو۔

مردوں کی کسی بات نہیں ان میں۔ کبھی ہمارے یہاں آؤ تو تمہیں دکھاؤں میں۔“

ایلی مسحور ہو کر بیگم کی باتیں سنتا۔ اس وقت اس کی نگاہوں میں نور پور کا وسیع میدان پھیل جاتا اور قلعے کے برج ابھرتے اور وسیع فراخ کمرے کھلتے اور بالآخر ایک زردینڈ ک اور دو حصائی انکھیاں اس کی طرف بڑھتیں۔

پھر شام کے وقت جب سورج غروب ہونے کے لئے مغرب میں اترتا تو ایلی کوٹھے پر چڑھ جاتا اور کتاب ہاتھ میں لے کر وباں ٹھہتا جیسے عبق یاد کر رہا ہوتا کہ متصل کوٹھے پر سانوری کوڈا ملکے سکے اور متصل کوٹھے پر ہلکے رنگوں میں مابوس سانوری یوں ٹھہتی جیسے اسے ایلی کی موجودگی کا احساس ہی نہ ہو۔

اس کی بڑی بڑی آنکھیں وور کسی افق پر مرکوز ہو جاتیں۔ اس کا دوپٹہ یوں لکھتا جیسے تاج پوشی کی تصاویر میں شہزادیوں کے پیچے ریشمیں کپڑے لٹکتے ہیں۔ لیکن لیکن۔ اس کی اوپنی ایڑی والی گرگابی بلطف لے میں تال دیتی اور پھر نہ جانے کیا ہوتا۔ گردوپیش کے دھنڈے مکانات بزر پیرا ہم پہن لیتے اور چوبارے یوں دکھائی دیتے جیسے تنگوں سے بنے ہوئے جنگلی جھونپڑے ہوں اور پھر دوسرے بانسری کی سریں بلند ہوتیں اور کرشن کنھیا گوکل کے بن میں ٹھہلتے اور ان کے چہرے کے ریشمیں سانو لے پن میں اشیر باد کی مدھم روشنی چمکتی اور نیچے چوگان میں کوئی راکشش ارجمند کے روپ میں چلاتا۔ ”نندگاؤں والے اے او گوکل کے پچاری۔ لو بھی یہ حضرت ہاتھ سے گئے۔ نہ جانے کیا زمانہ آیا ہے۔ چھولوں کو بڑوں کا لحاظ نہیں رہا۔ اب بتاؤ۔ اقر بامیرے کریں خون کا دعوے کس پر۔“

گل حکمت کا متوالا

پھر بیٹھے رفیق کو سوچھی۔ رفیق کو ہمیشہ ہی سوچھا کرتی تھیں اگرچہ بظاہروہ ایک خاموش لڑکا تھا۔ رفیق کی تمام ترقوت اس کی آنکھوں اور گالوں میں سمٹ کر آگئی تھی۔ جہاں تک زبان کا تعلق تھا وہ گونگا تھا۔ اس کے ساتھ کوئی بات بھی کرو تو وہ

مسکرا دینا اس کی مسکراہٹ میں تلخی نہیں ہوتی تھی۔ ایسی بات کرو جو اسے ناپسند ہو تو اس کے ہونٹ ہلکے سے کھل جاتے اور اس کی آنکھوں میں بوندا باندی شروع ہو جاتی۔ ایسی بات چھیڑ دو جو اس کے لئے تکلیف دہ ہو تو وہ گھبرا جاتا۔ اس کے ہونٹوں سے اف اف کی آواز لکھتی چیزے اس نے کوئی گرم چیز منہ میں ڈال لی ہو اور اس کی حرکات افطرابی رنگ اختیار کر لیتیں۔

بے زبان ہونے کے باوجود رفتق بے حد حساس تھا۔ اس کی طبیعت میں دلبی رنگیں تھیں۔ صحیح سوریہ میں وہ شریف کے یہاں جا پہنچتا۔ ”چیز کوئی چیز تو نہیں منگوانی۔“ اور پھر جب پچھلیں اشتہار کی طرح اس کے سامنے آتی تو وہ گھبرا کے پچھے ہٹ جاتا اس کی آنکھیں بھیگ جاتیں اور کوئی رنگیں سر گلے میں پھنس جاتا شدت تاثر سے وہ اف اف سی سی کرتا۔ آنکھوں کی بوندا باندی اور تیز ہو جاتی۔ رفتق دلبی آنچ کو پسند کرتا تھا۔ وہ گل حکمت کا متوا لاتھا۔ اسے بھرک کر جانے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کے کردار میں دو پہلو نمایاں تھے رنگیں اور جھجک۔

آن ملا تھا

اس کے باوجود رفتق کو اکثر سوچتی تھیں۔ اب کی بارے لاجواب بات سوچیں اور محلے کے کڑکے بات سن کر متفقہ طور پر جھومنے لگے۔

”میں کہتا ہوں۔“ وہ بولا۔ ”اگر ہم ایک ڈرامہ کھیلیں تو۔“

”ڈرامہ۔“ ایلی کے دل میں گویا ایک رنگیں ہوائی چل گئی۔

”ڈرامہ۔ آہا۔ کیا بات ہے۔“ ارجمند چلایا۔ کرشن کہیا ٹھیک رہے گا۔ آہا۔ ادھر گائیاں ادھر گوپیاں اور رتھ۔ میں بندرا بن کا گوکل۔“

”ڈرامہ۔“ صدر نے ایک لمبی آہ بھری اور سگریٹ کی راکھ جھاؤ کر شانے پھیلا کر گلنگا نے لگا۔ ”حافظ خدا تمہارا۔“

یوسف سپا ہیانہ نہیں ہے۔ ”یہ بھی کرو بھو۔“ وہ بولا۔

رضانے اپنی لگڑی ناگ جھلا کر کہا۔ ”میاں کوئی بادشاہ کا پارٹ ہوتا ہمیں دے دینا باقی سب خیریت ہے۔“

صفدر کے دالان میں پردوں کی جگہ کچیں اور چادریں لکائی گئیں۔ کیونکہ اس کے سامنے صحن کے اوپر کی چھت گلیری کا کام وے علقت تھی۔ جہاں سے محلے کی عورتیں ڈرامہ دیکھتی تھیں۔ آغاختر کے کھیل ”خوبصورت بیا“ کا ایک رنگین لکڑا کھینے کے لئے چنا گیا۔ رفیق نے گلخیر و کاپارٹ سنjal لیا۔ ارجمند زمیک کا کام ملا اور اسی طرح سب ہی پارٹ محلے کے بڑے لڑکوں نے سنjal لئے اور وہ سب شدت سے ریہر سکل میں منزوف ہو گئے۔

اس رات صحن کھچا بھج لڑکوں سے بھرا تھا اور پر گلیری میں بیس تیس عورتیں بیٹھی تھیں۔ بستر کے لگکے ہوئے کھیسوں اور چادروں کے پیچھے گلخیر و کی آنکھوں میں گلابی رنگ کی بومبا انڈی ہو رہی تھی۔ ارجمند زمیک کے بھیں میں پر یم پتھر اور پر یم ٹونا سنjal لے کھڑا تھا۔ صفر بہایت کا رکی حیثیت سے شانے پھیلانے۔ ”اے دربا میں ہوں ندا۔“ گلگٹار ہاتھا۔

کھیل شروع ہوا۔ ایکسریوں منہ اٹھا کر با تیں کر رہے تھے، جیسے اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوں۔ گلخیر ولقہ کبوتر کی طرح سینے کو دہرا کئے کھڑا تھا۔ زمیک چھت سے با تیں کر رہا تھا۔ پرمٹ کرنے والوں کے لئے کتاب پر نظریں جمائے رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ پٹا خد بجا بھی دیتے تو پرده کھینچنے والے کو معلوم ہی نہ ہوتا کہ اسے پرده کھینچنا چاہیے۔

اڈھر زمیک سامنے منظر کی وجہ سے اس حد تک مست ہو گیا تھا کہ ان جانے میں اس نے ڈنڈے کو یوں تھام لیا تھا جیسے وہ ایک بانسری ہو۔ صرف ایلی کی نگاہیں جھکی تھیں۔ اسے زنانہ پارٹ کرنے میں شرم محسوس ہو رہی تھی۔

تماشائی بار بار تالیاں بجارتے ہیں۔ گلیری کے دھنڈ لکے میں سفید سفید دافت

چمک رہے تھے۔ ہلکی ہلکی روپی گھنٹیاں بج رہی تھیں جنہیں سن کر ادا کار اور بھی چمکتے اور ان کے لئے اپنے پارٹ پر محدود رہ جانا مشکل ہو جاتا اور وہ اپنی طرف سے بڑھا چڑھا کر مرکا لے بولتے۔ آخری گانے پر زبردست تالیاں بیٹھی گئیں۔ گیلری سے دبایا واہ وا کا شور بلند ہوا۔ اس پر گانے والے اور بھی چمکتے اور وہ جوش میں گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے لگے اور وہ اپنے بازو جھلاتے ہوئے چلایا۔ آن ملا تھا۔ اک پر دلی چیز بھول نہ جانا۔ جیسے گیلری میں کسی سے مخاطب ہو۔ اس پر تالیوں کا طوفان اور بھی تیز ہو گیا۔ گیلری سے ببا آواز بلند نظرے سانی دیئے اور آخری ڈریپ گرا دیا گیا۔

کون خوش نصیر

اگلے روز جب ایلی چائے پینے کے لئے شریف کے گھر بیٹھا تھا اور شریف دو ایک منٹ کے لئے اسے اکیلا چھوڑ کر خود کو ٹھے پر گیا ہوا تھا تو دفعتاً قریب ہی سے اک سریلی آواز اس کے کان میں پڑی اور اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ کوئی گارہی تھی۔

”آن ملا تھا اک پر دلی چیز بھول نہ جانا جی۔“ اس نے لپک کر لمحتہ کرے میں جھاٹک کر دیکھا۔ سانوری کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ جن پر لمبی لمبی پلکیں سایہ کئے ہوئے تھیں۔ اس کے سانورے رنگ میں محملی چمک تھی اور کھڑے ہونے کے انداز میں واضح پر دلگی ایلی کا دل اچھل کر اس کے گلے آ اٹک۔ وہ بھٹی بھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا وہ مسکرائے جا رہی تھی۔ ایلی کا جی چاہتا تھا کہ اس سے بات کرے اس سے پوچھئے۔ ”تم سانوری ہو۔ کیا واقعی۔“ مگر اس میں اتنی جرات نہ تھی۔

شام کو ایلی جب دولت پور جانے کی تیاری میں مصروف تھا تو دفعتاً وہ چوڑکا۔ ”ارے۔“ وہ چلایا۔ ”اس نے تو کہا تھا۔ پیارے بھول نہ جانا جی۔ پیارے ہاں

ہاں یقیناً اس نے پیارے کہا تھا۔ لیکن گیت میں تو پیاری تھا۔ ہاں ہاں۔ پیاری بھول نہ جانا جی۔ پھر سانوری نے پیارے کیوں کہا تھا۔ پیارے سے اس کا مطلب کیا تھا۔ کس سے مخاطب تھی وہ۔ اس وقت کمرے میں تو کوئی بھی نہ تھا اور وہ کھڑکی میں تو نہ تھی۔ کھڑکی سے دوڑاں دروازے کے قریب جو گھر میں کھلتا تھا۔ ”ایک ساعت کے لئے اس کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔ ”شاید، اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ ”نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کیسے ہو سکتا ہے یہ مجھ میں ہے ہی کیا لاحول والاقوٰۃ مجھ سے یہ جملہ کیسے کہا جاسکتا ہے۔ پھر سانوری کہے۔

”لیکن پھر وہ کون تھا۔ کون تھا۔“ وہ سوچ نہیں پڑ گیا۔ ”نہ جانے کون تھا۔ کوئی خوش نصیب ہو گا۔“

اس کی چھٹیاں کیسے تازک وقت پر ختم ہوئی تھیں۔ اگر وہاں کچھ دیر اور رہتا کاش۔ کم از کم اسے یہی معلوم ہو جاتا کہ وہ خوش نصیب کون ہے۔

پھر جب وہ شریف کو خدا حافظ کہنے کے لئے شہزاد کے گھر گیا تو اس نے دیکھا کہ سانوری کھڑکی میں کھڑی تھی۔ خاموش اداس، ایک ساعت کے لئے اس کی پلکیں اٹھیں اس نے ایک ساعت کے لئے نگاہ بھر کر ایلی کی طرف دیکھا۔ ایک واضح آہ بھری پھر اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ سانورے رنگ کی لمبتوڑی انگلی نے یوں رخسار کو چھو جیسے آنسو پوچھ رہی ہو پھر اس نے منہ موڑ لیا۔

”تم جا رہے ہو ایلی۔“ شریف مسکرا یا۔ ”جاوَ چلے جاؤ۔“ اس اندھے کنوئیں سے بھاگ جاؤ۔ جاؤ وہاں جہاں لوگ محبت کرنے کو گناہ نہیں سمجھتے جاؤ محبت کرو ایلی جاؤ۔“

ڈیوڑھی میں رفیق سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس نے ایک لمبی آہ بھری۔ سی سی کی مدھم آواز سنائی دی۔ ”میں بھی جا رہا ہوں ایلی،“ وہ بولا۔ ”نوکری مل گئی ہے۔ مجھے اب جانا ہی ہو گا۔“ وہ یوں آہیں بھر رہا تھا جیسے نوکری کامل جانا بد قسمتی ہو۔

لائیں کے قریب ارجمند کھڑا اس کی راہ دیکھ رہا تھا۔ ”یہ تم نہیں جا رہے ایلی۔“
وہ بولا۔ ”تمہیں کون خاطر میں لاتا ہے۔۔۔“ وہ رک گیا۔

”لیکن کیا۔“ ایلی نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”پچکاری سے رنگ جا رہا ہے۔ بازیری سے نگہ جا رہا ہے۔“ ارجمند نے آہ بھر کر کہا۔

”پاگل ہو گئے ہو۔“ ایلی نے اسے گھورا۔

”ہاں۔“ اس نے ہفتے کی ناکام کوشش کی۔ ”جج کہتا ہوں۔“ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

”سانوری کہیا نے پاگل کر دیا ہے کیا۔“ ایلی نے پوچھا۔

گوپیوں کے بغیر کہیا کیا ہے۔ پچھلی نہیں اتنا بھی نہیں جانتے تم۔ ارجمند نے پیغیر ابدالاً ”چلے جاؤ۔“ دفعہ ہو جاؤ۔ جاؤ ہم حکم دیتے ہیں جاؤ۔ ماید والت کافرمان بجا لاؤ۔ جاؤ۔.....“

تیکم اور پنچ

ترب کی آرزو

اب کی بار دولت پور میں پہنچ کر ایلی کے خیالات اور حیات بدل رہے تھے۔ اس کے احساسات میں نئی بیداریاں پیدا ہو رہی تھیں۔ خیالات میں تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ جسم میں نئے تقاضے ابھر رہے تھے۔ اس کے دل میں عورت کے قرب کا شوق پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا بھی چاہتا تھا کہ عورت کے قریب جائے۔ اسے قریب سے دیکھے اسے پیار کرے مگر یہ یہ ممکن ہو سکتا تھا۔ آصفی سماج میں کسی عورت کے قریب جانے کا امکان نہ تھا۔ اور اگر ہوتا بھی تو ایلی میں اتنی جرأت کہاں؟ بہر حال اس کی خواہش تھی کہ کسی کی بانہ پہنچ لے اور پھر زودے پھر اسے اس کوچ کا خیال آتا جہاں سے سارنگی کی سریں گونجا کرتی تھیں۔ لیکن..... اگر بغرض محال وہاں چلا بھی جاتا تو ان عورتوں کو دیکھ کر عجیب سی کراہت محسوس ہوتی جو لاثین جلانے ہوئی پیٹھی مردوں کا انتظار کیا کرتی تھیں۔ وہ حقیقت وہ انہیں عورتیں ہی نہیں سمجھتا تھا۔

اس کوچے میں پہنچے بغیر کسی عورت سے قرب ممکن نہ تھا کسی کو بلوریں پاؤں سکھاتے ہوئے دیکھتا یا کسی کو کھڑکی سے جھانگلتے ہوئے ایک نظر دیکھ لیتا تو اسے اور بھی مضطرب کر دیتا تھا پھر عورت سے قرب کی آرزو کیسے یوری ہو سکتی تھی۔

پھر فعلہ اسے ایک خیال آیا۔ ایک مکروہ بھیا نک خیال۔ اور وہ لرز گیا مگر لرزنا پیکار تھا اس کا مسلسل طور پر اس خیال پر لاحول پڑھنا پیکار تھا کیونکہ ابتداء سے ہی یہ خیال اس کے دل کی گہرائیوں میں بیٹھے چکا تھا جب وہ ابھر کر ایلی کے شوری ذہن کی طرف یورش کرتا تو ایلی اسے پھر دبادتا اور اس طرح اپنی دنیا کو محفوظ کر لیا کرتا مگر وہ دبایا ہوا خیال اندر رہی اندر دل کو متغیر کیے جا رہا تھا۔

جنیاتی محور

ایلی کی تمام تر جنسیاتی زندگی علی احمد کے مخور کے گرد کھو گئی تھی جب کوئی جو نک ان کے گھر آ کر علی احمد کا خون چونے کے شغل میں مصروف کار ہو جاتی تو وہ غصے سے بھوت بن جاتا۔ علی احمد کو ایسی زندگی بس کرنے کا حق نہیں۔ اسے ٹین کے سپاہی کا کروار ادا کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اسے اپنے آپ کو لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل کرنے کا کیا حق ہے۔ کیا اسے ایسی سستی قسم کی عورتوں کے علاوہ کوئی باعزت عورت نہیں ملتی۔ وہ اس بات پر بیش وقت اکھاتا۔ اور اگر سارہ صبورہ کی باعزت لڑکیاں علی احمد کے رنگیں جاں میں پھنس جاتیں تو بھی اسے غصہ آتا۔ کیا اسے اپنی عمر کی عورتیں نہیں ملتیں۔ کیا اسے اس قسم کی سستی عورتیں نہیں مل سکتیں جو روپے کے عوض خریدی جاسکتی ہوں۔ ہر صورت میں اسے علی احمد پر غصہ آتا اور غصے کے بہانے اس کے جنسی پہلو میں ابال آ جاتا اور پھر وہ چوری چوری سوچتا کہ عورت سے قرب حاصل کرنے کا ایک طریقہ ہے ایک واحد امید اور پھر ایک عمر سیدہ عورت بالدوں سے جھانکتی اور اس کی طرف دیکھ کر مسکراتی۔ اسے اپنی طرف بلاتی اور اس کا جی چاہتا کہ اس کی گود میں سر رکھ کر رودے۔ روتا رہے حتیٰ کہ جسم کا درد درد ہو جائے۔ ہڈیوں میں جو چیزوں نیاں سی چلتی تھیں چلکیاں لیتی تھیں ان سے نجات حاصل ہونسوں میں جو تناو سا سے پریشان رکھتا تھا وہ ختم ہو جائے لیکن دفعتاً وہ گود میں پڑے ہوئے محسوس کرتا کہ وہ اس بھر پور عورت کو جانتا ہے اس کی شکل و صورت مانوس سی دکھائی دیتی اس کے منہ سے ایک چیخ نکل جاتی۔ اور وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتا اور پھر معدوم ہونے کی کوشش میں کھو جاتا۔

پائے ایلی!

اب کی بار جب وہ دولت پور میں آیا تو اس کے خیالات کی دنیا میں نئی تفصیلات کا اضافہ ہو گیا تھا۔ بیٹھے بٹھائے ایک رنگیں سی آواز اس کے کان میں پڑتی پیارے بھول نہ جانا جی۔ ایک ملیح تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے جھملاتی۔ پھر ایک بامعنی

ہنسی۔ واضح اور نگین اور بالآخر مژگان کے دو گھنے چھتر جھک جاتے اور ایک لمبی سی مخروطی پر نم انگلی فضا میں ابھرتی۔ پھر دفعتاً چھم سے کوئی آ جاتا اور منظر یوں بدلتا جاتا چیزے پتھر گرنے سے جھیل کے ساکت پانی میں ساحل کے ایوانوں کے دھنڈے اگر حسین نقوش دفعتاً پاش پاش ہو جاتے ہیں اور چاروں طرف اہر میں اٹھنے لگتیں۔ پھر فضا میں چاروں طرف مرکری دیوتا کے لخنوں پر لگے ہوئے نہیں بازو پھر پھراتے۔ بالوریں پاؤں رقص کرتے اور بال دو پٹے اور مژگان ایک زناٹ سے اس کے قریب سے نکل جاتے اور دوڑ۔ وہ ایک مدھم حسین آواز گنگائی ہوئی شنائی دیتی۔ ”ہائے ایلی وہ چائے پر انتظار کر رہے ہیں۔“ اس وقت ایلی چونکتا اور شرم سے سر جھکا لیتا۔ ایک نہم سا احساس جنم اس کے دل و دماغ پر چھا جاتا۔ وہ ایک بخوبی سی حسین عورت سفید آنچل پھیلائے اڑے جاتی۔ اور اس کا جی چاہتا کہ کہیں سر رکھ کر رو دے اتنا روئے کہ کوئی ہاتھ پک کر اسے تھکنے پر مجبور ہو جائے۔ قریب ہی سے شریف کامدھم تھکہ گونجتا۔ ایلی محبت کرو۔ محبت کرو چاہے کسی چیز سے کرو محبت کرو۔ محبت کیے بغیر تم کچھ بھی نہیں؟ وہ اپنا سر لحاف میں گاڑ دیتا آنکھیں بند کر لیتا۔ نہیں نہیں میں مجرم نہیں ہوں میں جرم نہیں کروں گا۔ اور پھر نہ جانے کہاں سے دو بالوریں ہاتھ اس کی طرف بڑھتے اور ہمدردی بھرے لمس سے اسے تھکنے لگتے اور وہ یوں روتے روتے سو جاتا جیسے کوئی بچہ کسی کھلوٹے کو حاصل نہ کرنے پر روتے روتے تھک کر سو جاتا ہے۔

چھجوکا چوبارہ

خوش قسمتی سے انہیں دنوں ایلی کا بہنوئی اجميل دولت پور میں آ گیا۔ اے دولت پور کی کچھری میں ایک نو کری مل گئی تھی۔

ایلی کو اجميل سے بہت ہمدردی تھی۔ کیونکہ کئی ایک پہلوؤں سے اس کی اپنی زندگی اجميل سے ملتی تھی اس کے علاوہ اجميل نے اوائل عمر میں ہی بصرہ اور کابل

سے وور دراز مقامات کے سفر کیے تھے جن کی وجہ سے اس کے دل میں اجمل کی عزت پیدا ہوئی تھی۔

اجمل اونچے لمبے قد کا لڑکا تھا جس کی قابلیت پر ایسا بخیر محسوس کیا کرتا تھا اور سب سے بڑھ کر اسے اجمل کی نکلن طبیعت بہت پسند تھی۔ باجرہ کی نکتہ چینی کے باوجود دیا شاید اسی وجہ سے اسے اجمل بہت پسند تھا اور وہ محسوس کرتا تھا کہ اجمل اس کا دوست ہے۔

اجمل کے دولت پور آجائے سے ایلی کو ایک سہارا مل گیا کیونکہ اجمل نے وہاں پہنچتے ہی اپنے اثر رسوخ سے علی احمد کے گھر سے لمحتہ چھبوکا چو بارہ کرائے پر لے لیا اور ایلی کے لیے اجمل کا گمراہ ایک نعمت غیر مترقبہ ہو گیا۔ ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ اجمل سے آجائے سے ایلی نے شیم کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھانے سے نجات پالی اب اسے پہلوان کی دوکان پر جا کر دودھ اور بن کھانے کی بھی ضرورت نہ پڑی تھی۔

اوہر علی احمد نے ایک بار پھر۔ پرانے انداز کو اعلانیہ اپنالیا تھا شاید اس لیے کہ کشمیر کا سب اپنی تمام تر نگینی کھو چکا تھا۔ اب علی احمد کو ان بل کھاتی ہوئی گلیوں سے گزر کراتی دوڑ راجو کے گھر جانا نہیں پڑتا تھا بلکہ راجو خود ان کے یہاں آزادی سے آتی جاتی تھی اور علی احمد کا کمرہ ایک مرتبہ پھر وہی بام آباد کمرہ بن گیا تھا جہاں ریڑ کی گڑیا چھینتی۔ اور ٹین کا بکتر بند سپاہی جنگ کے نعرے لگاتا اور پھر نگینی ہنسی کی آواز سنائی دیتی جسے سن کر شیم غصے سے بل کھاتی اور پھر انتقاماً عقیبی کھڑکی میں جا کھڑی ہوتی اور آنسو پوچھ کر مسکرانے کی کوشش کرتی۔

نہ جانے کیوں

نہ جانے کیوں عورتیں ریڑ کی گڑیوں کی طرح کیوں چیس چیس کرتی ہیں اور مرد ٹین کے سپاہی کیوں بن جاتے ہیں۔ کیا سمجھی مرد ٹین کے سپاہی بن جاتے ہیں کیا

سبھی عورتیں رہڑ کی گڑیوں کی طرح چیس چیس کرتی ہیں۔ ان کے منہ سے بچوں کی طرح لاڈ بھری تو تلی باتیں کیوں نکلتی ہیں۔ ویسے عام بات کریں تو ان کا لہجہ بالکل صاف ہوتا ہے۔ ذرا تو تلاپن نہیں ہوتا آواز میں لوچ نہیں ہوتا۔ ان امور کے علاوہ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ علی احمد کس معيار کے مطابق عورتوں کو پختہ تھے۔ مثلاً وہ کوئی تھی۔ یہ راجو تھی۔ ان میں کوئی کش بھی تو نہ تھی۔ کوئی بات بھی تو نہ تھی جسے قابل ستائش یا دلکش سمجھا جاسکتا۔ کیا حسن و خوبصورتی کی خصوصیات کے ویسے کے بغیر عورت بذات خود قابل حصول ہوتی ہے لیکن یہ کیسے ممکن ہے۔ پچھلے عورتوں کو دیکھ کر تو ایلی کو گھن آتی تھی۔

ایلی محسوس کرتا جیسے عورت ایک معینہ وایک آیدا معمول جو بندگمرے کے بغیر حل نہ ہو سکتا ہوا س خیال پر اسے شدید خوانش محسوس ہوتی کہ ایک بار اسے بھی کسی عورت کے ساتھ کمرے میں بند ہونے کا اتفاق ہوا اور اس کے رو برو بھی وہ اسرار کھل جائیں صرف ایک بار۔ ایک بار۔

وہ راجو یہ راجو

ایک روز رات گئے جب ایلی گھر پہنچا تو علی احمد کے کمرے کے قریب پہنچ کر وہ شھنھکا کمرے سے ٹین کے سپاہی کے نعروں اور رہڑ کی گڑیا کی چیس چیس کی بجائے عجیب سی آوازیں آ رہی تھیں کوئی کراہ رہی تھی کوئی مدھم آواز میں ہمدردی جتارہا تھا۔

ابھی وہ اپنے کمرے میں داخل نہ ہوا تھا کہ دفتار علی احمد کے کمرے کا دروازہ کھلا اور اندر سے ہنستی کھیلتی راجو کی جگہ شحیف وزیر راجو برآمد ہوئی۔ اس نے اپنا ہاتھ علی احمد کے کندھے پر رکھا ہوا تھا اور بصد مشکل سہارا لے کر چل رہی تھی۔

”ایلی، انہوں نے باہر نکلتے ہی ایلی کو آواز دی۔ ”ادھر آؤ ذرا۔ ہمارے ساتھ چلو۔“

”اس وقت اتنی رات گئے۔“ شیم زیریب بولی۔

”ضروری کام ہے ابھی لوٹ آئیں گے۔“ انہوں نے بے رخی سے جواب دیا۔ ”چلوایاں۔“

”اس بیچارے کو کیوں ساتھ خراب کرتے ہو۔“ شیم نے کہا۔

”چلوایاں۔“ علی احمد نے شیم کی بات نہ سنی قافلہ چل پڑا۔ برقے میں لپٹی ہوئی راجو علی احمد کے ساتھ گھٹ کھٹ کر چل رہی تھی۔ اور علی احمد نے اسے یوں سہارا دے رکھا تھا جیسے وہ بیمار ہوا پیچے پیچے ایسا سوچتا ہوا چلا جا رہا تھا نہ جانے کیا بات ہے۔ نہ جانے کرے سے یہ کوئی سی راجو لٹکی ہے۔ راجو ایسی تو نہ تھی۔ وہ تو کثرکثر باتیں کیا کرتی۔ آنکھیں ملکانی نخترے کرتی۔ یہ راجو تو روئی روئی سی تھی۔ نہ جانے وہ کدھر جا رہے تھے۔ کیوں جا رہے تھے اور چلتے ہوئے راجو گھٹ کیوں رہی تھی راجو اپنے گھر پہنچ کر دھڑام سے چارپائی پر گر پڑی اور علی احمد دوڑ کر دوسرا چارپائی کے قریب کھڑے ہو کر چلانے لگے۔ ”حیمن دوڑ دوڑو۔ دیکھو راجو کو کیا ہو گیا ہے۔“

کیا ہے۔ کیا ہے۔ چاروں طرف سے عورتیں راجو کی طرف لپکیں اور یک آن میں بھیڑ لگئی۔

صرف وہ بڑھیا دور کھڑی چلاتی رہی۔ ”کیا پا گھنڈ مچا رکھا ہے تم دونوں نے۔ میں مرتا ہوں۔ میں مرتا ہوں اور مرتا کوئی بھی نہیں نخترے دکھانے شروع کر رکھے ہیں۔ میں کہتی ہوں یہ شخص کیوں آتا ہے اس گھر میں اور یہ مرنے جوگی اس سے کیوں ملتی ہے اس سے تو یہی بہتر ہے کہ مر جائے خس کم جہاں پاک۔“

”پاگل ہو گئی ہو ماں،“ راجو چلائی۔ ”لڑکی بے ہوش ہے ہاتھ سے جا رہی ہے اور تو کھڑی وعظ کر رہی ہے جیسے کے سے آئی ہو۔“

”تو مجھے ماں نہ کہا کرڑاں۔“ حیمن چھینی۔

راجو جیرانی سے کھڑی دیکھ رہی تھی۔ اس کے ٹوٹے ہوئے ہاتھ چھاتی پر پڑے
تھے منہ خوف سے اور بھی بد نما ہو گیا تھا۔

راجو کے رخسار پھول رہے تھے جیسے باسی ڈبل روٹی میں ابال آگیا ہو۔

سیلز میں نے بڑھ کر راجو کو اٹھا کر بٹھا دیا۔ سا جو نے اس کی مدد کی علی احمد نے
سرسری طور پر سہارا دیا لیکن بیٹھنے کی بجائے وہ ڈھیر ہو کر گرفتاری۔

یہ دیکھ کر علی احمد گھبرا گئے۔ ”کاغذ کھاں ہے دوات دوات۔“ وہ چلانے لگے کچھ
دیر تلاش کرنے کے بعد انہوں نے کاغذ اور دوات علی احمد کو دے دی۔ علی احمد نے
کاغذ پر کچھ لکھا اور چادر میں آپٹا ہوا سیلز میں اسے لے کر بھاگا۔

چھوٹے کمرے میں ریسمن کھڑی چلا رہی تھی قریب ہی سا جو غصے سے گھور رہی
تھی۔ باہر والان کے ایک گونے میں آجو کبھی ہوئی بیٹھی تھی۔ اس سے پرے ٹوٹی
ہوئی کھاث پر ایلی بیٹھا سوچ رہا تھا نہ جانے کیا ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے۔ راجو کیوں
چارپائی پر ڈھیر ہوئی پڑی ہے اس کی ماں بیٹی سے ہمدردی کرنے کی بجائے ان
سب کو صلواتیں کیوں سنارہی ہے اور علی احمد اس قدر گھبرا نے کیوں ہیں۔

پھر دروازہ کھلا اور چادر میں لپٹے ہوئے سیلز میں کی آواز سنائی دی ”ڈاکٹر
صاحب آگئے۔“

”ڈاکٹر“ ایلی! نے دیوار کی طرف منہ پھیر لیا۔ کہیں ڈاکٹر پہچان نہ لے۔ اس
مکان میں دیکھنے لے لیکن علی احمد علی احمد بھی تو اسی گھر میں تھے اور علی احمد کا کیا ہوگا۔
اگر علی احمد کو ڈاکٹر نے پہچان لیا تو۔

علی احمد کھیانی بھی نہیں رہے تھے ”ہی ہی ہی ڈاکٹر صاحب مریضہ بے ہوش
ہے آدھے گھنٹے سے یونہی پڑی ہے۔“ ”اسے اندر لے چلو۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ اور وہ
سب راجو کو اٹھانے کے لیے دوڑے۔

اس دوران میں ساجو آگئی اور ایلی کے قریب بیٹھ کر پان لگانے لگی انہیں میں اس کے سفید دانت چمک رہے تھے۔

”گڈی گڈے کا حکیل بنار کھا ہے نبوں نے۔“ اس نے کسی کو مخاطب کیے بغیر کہا۔ ”بس اپنا ہی ہوش ہے وہ مرے جائیں جہنم میں اب تم ہی بتاؤ انہیں ایسا کہا چاہیے تھا کیا۔“ وہ رُک گئی۔ پھر آپ ہی آبولی۔ ”راجو کے خصم کو پتہ چلا تو کیا ہو گا۔ اسی بات کا خیال ہونا چاہیے تھا انہیں دولت پور میں وہ کونسا چوک ہے جہاں ان کی باتیں نہیں ہو رہی ہیں۔ کیوں نہ ہوں۔ ڈھنگ سے باقی کپڑیں تو ہے۔ ناوہ ایک رات بھی اس کے بغیر نہیں رہتی اور اگر رہ بھی سکتی تو یہ بڑھا بچوں کی طرح بلکہ لگتا ہے۔ اور رہی آئی بات اس پڑھیا نے فروکشی ہے کہ وہوں پر ہاتھ رکھ کر چینتی ہے جو کسی نے نہیں سنی بات تو یہ اللہ کی بندی اسے سنا کر رہے گی۔ پان کھاؤ گے۔“ وہ ایلی کے قریب سر ک آئی۔

قریب بہت ہی قریب ساجو کے میلے دانت چمکے بو کا ایک ریلا آیا۔ ایلی نے محسوس کیا جیسے اسے کسی گندے نالے میں وحکیل دیا گیا ہو۔ جہاں گلے سڑے گوشت کا ڈھیر لگا ہو۔ وہ گھبرا کے اٹھ بیٹھا۔ ”پان تو کھائے،“ ایک سیاہ بازو اس کی طرف لپکا۔

”نہیں نہیں۔“ ایلی نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

”کافتا ہے کیا۔“ وہ عجیب انداز سے بولی۔ ”اچھا بیٹھ تو جا۔“ اور وہ اس سے دور ہٹ کے چار پانی کے ایک کونے پر بیٹھ گیا۔

نیا عقدہ

چھوٹے کمرے کا دروازہ کھلا ڈاکٹر باہر نکلتے ہوئے بولا۔ ”اسے اکیلے پڑا رہنے دو۔ شاید ٹھیک ہو جائے۔ کل صبح مجھے اطلاع دینا۔“ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ ایک بار پھر سب نے چھوٹے کمرے کی طرف یورش کر دی اور وہاں لڑنے جھگڑنے لگے نہ

جانے کیا بات تھی جس پر وہ جھگڑہ ہے تھے۔ بڑھیا چلا چلا کر رورہی تھی۔ جیسے غصے سے برآ ہوا بلیڈر پھٹ گیا ہو۔ ساجو طعنے دے رہی تھی۔ سیلز میں شاید اپنے ذریعہ تجارت کوتباہ ہوتے دیکھ کر بولکھا گیا تھا۔ اس کے منہ سے بات نہ لکھی تھی اور علی احمد فطراب میں ٹھیل رہے تھے جیسے وہ کمرہ ایک سحر ہو۔ ہاتھ کو ہبوں پر رکھے ہوئے تھے ٹوپی ماتھے پر اٹی ہوئی تھی۔

آہستہ آہستہ شور کم ہوتا گیا۔ بڑھیا کی چکیاں مدھم پر میں ساجو کے طعنے نفرت بھری نگاہ تک محدود ہو گئے۔ آجودروازے کے باہر چوکھت کے قریب سہی ہوئی کھڑی تھی اس کے منہ سے بات نہ لکھی تھی۔

دیر تک خاموشی طاری رہی۔ رہیں راجو کی کوٹھری میں جا کر لیٹ گئی۔ آجوبہر کھاث پر ڈھیر ہو گئی ساجو پانداں سامنے رکھے بکری کی طرح جگالی کرتی رہی علی احمد ویسے ہی گھبراہٹ بھرے انداز میں ٹھیلت رہے پھر راجو کراہنے لگی علی احمد اور ساجو دوڑ کر اندر چلے گئے کچھ دیر کے بعد وہ دونوں باہر نکلے۔ ساجو کو لہے مٹکاتی ہوئی باہر نکلی۔ پھولے ہوئے جسم میں سفید سفید دانت اور آنکھیں چمکیں۔ پیچھے پیچھے علی احمد تھے ایلی کو دیکھ کر وہ چونگے۔

”تم۔ تم یہاں تم۔“ جیسے وہ ایلی کو ساتھ لانے کی تفصیل بھول چکے ہوں ”اچھا اچھا خیر۔“ دنکھا وہ گھبرا کر کے گئے۔ ”اب اس وقت تو گھر جانا ٹھیک نہیں۔“ انہوں نے ایلی سے کہا۔ ”رات بہت گزر چکی ہے۔ یہیں لیٹ کر سور ہو۔ صبح سوریےے چلے جائیں گے۔“

زہر

علی احمد کے انداز میں غیر معمولی ملامت پیدا ہو گئی تھی نہ جانے کیوں؟“ اور دیکھنا، علی احمد اس کے قریب بیٹھ کر رازدارانہ انداز میں کہنے لگے ”گھر جا کر یہ نہ کہنا کردا جو بیمار تھی۔ کہ راجونے زہر کھالیا تھا۔“

زہر۔ ایلی سکتے میں رہ گیا۔ کیا واقعی راجونے زہر کھایا تھا۔ مگر کیوں کیا سے علی
احمد سے محبت تھی؟ کیا راجو بھی محبت کی اہل تھی لیکن۔ وہ سیلز میں اور وہ دس کا نوٹ جو
اس روز وہ راجو کے لیے لایا تھا۔ اس کی وہ نگاہیں جو اس نے غلام محمد پڑا لی تھیں۔
نہیں اسے محبت نہیں ہو سکتی۔ پھر اس نے زہر کیوں کھایا تھا۔ ایلی کے لیے یہ ایک نیا
عقلہ تھا۔

”ساجو، علی احمد نے منت سے کہا۔“ مجھی ایلی کا کچھ اندازہ کر دو۔ دن چڑھنے
میں اب دو ایک گھنے ہی ہوں گے پر رہے کا کہیں۔“ یہ کہہ کر وہ راجو کے کمرے میں
داخل ہو گئے اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

محبت۔ نہ جانے محبت کیا ہوتی ہے۔ مگر نہیں محبت تو ایک پاکیزہ جذبہ ہے۔ ایلی
سوچنے لگا۔ نہ جانے لوگ عورت کے پیچے اس قدر اندھے کیوں ہو جاتے ہیں۔
عورت میں وہ کون سی کشش ہے۔ راجو بھی سیدھی سادھی گنوار لڑکی نے علی احمد کو
دیوانہ بنارکھا ہے۔ ایلی کے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ وہ عورت کو قریب سے
دیکھے اسے عورت کا قرب حاصل ہو۔ مگر کیسے حاصل ہو۔ کوئی صورت بھی ہوا۔ اس نے
چوری چوری اپنے گرد نگاہ دوڑائی۔ ایک طرف ٹوٹی ہوئی کھولی پر وہ پتلی دلی لڑکی
آجو پڑی تھی جس کی آنکھوں میں زرد رو میل لگا رہتا تھا اور جس کے ہاتھ ٹوٹے
ہوئے تھے۔ اس نے جھر جھری محسوس کی۔ آج میں کوئی بھی ایسی بات نہ تھی کہ اسے
عورت سمجھا جاسکے۔

بدلاو

”آؤ ایلی۔“ ساجو چار پائی بچھاتے ہوئے بولی۔ ”یہاں آجائو۔“ ایلی اٹھ کر
اس چار پائی پر جا پڑا۔ ایلی نے ساجو کی طرف دیکھا۔ نہیں وہ عورت نہیں۔ ایلی
کے لئے تو عورت ایک لطیف اور پاکیزہ چیز کا نام تھا۔ وہ سوچنے لگا نہیں نہیں یہ
عورتیں نہیں یہ تو جو نہیں ہیں اور وہ چپ چاپ پڑ گیا۔

ساجونے ایک عجیب سی دھن گلنگانی شروع کر دی۔ عجیب سی دھن تھی وہ جیسے کوئی کسی ویرانے میں تنہا بیٹھی کس کا انتظار کر رہی ہو۔ اس دھن سے جسم کی بوآتی تھی۔ وہ دھن جولائیں جلا کر بیٹھنے والی عورتیں ہی گلنگا سکتی ہیں۔

نفرت سے ایلی نے منہ موڑ لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن وہ گلنگا ہٹ لختہ پہ لختہ نگی ہوتی گئی جیسے کوئی آہستہ آہستہ ایک ایک گر کے کپڑے اتار رہا ہو۔ پھر چار پاپی کھینچنے کی آواز سنائی دی لیکن وہ اپنے خیال میں کھو یا ہوا تھا۔ اسے کسی ربوڑ کی گڑیا کی چیزیں چیلی سنائی دیے رہی تھیں۔ اس کی نگاہوں تلے پین کا سپاہی ابھر رہا تھا۔ بڑھ رہا تھا۔

”بابو، جی۔“ کور کی گئروہ آواز سنائی دی۔ سفیدِ وانت اندھیرے میں چمکے وہ سہم گیا۔ لیکن عین اس وقت خامن کے ہاتھ نے بڑھ کر کور کو پرے دھکیل دیا اور پھر وہ حسین بازو ایلی کی طرف بڑھا۔ اس لمس کی وجہ سے اندھیرے میں ایک الاؤ روشن ہو گیا سرخ چینی اڑے۔ چاروں طرف چیوٹیاں رینگ رہی تھیں۔ اس نے گھبرا کر پہلو بدلا۔ بوکاریلا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا ساجو کی چار پاپی اس کے ساتھ ملی ہوئی تھی اور ایک حریص جھوٹنی اس کی طرف بڑھ رہی تھی گھبرا کر پیچھے ہٹنے کی بجائے اس نے اپنے آپ کو بدرو میں پھینک دیا اور گرم غایظ جسم کے ایک بھکنے اسے آغوش میں لے لیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ جیخ مار کر اٹھ بیٹھے اور اس نائب میر سے اپنے آپ کو محفوظ کر لے لیکن اس کے بر عکس نہ جانے کیوں اس دیوانگی کے تحت جو اس پر مسلط ہو چکی تھی اس نے اس غلط بھرے جو ہڑ میں چھلانگ لگا دی۔ ایک لمس۔ ایک ڈکبی۔ آتش فشاں سے لاوے کا ایک ریلا اکلا جس نے ایلی کو منکر کی طرح بہا کرنے جانے کہاں پھینک دیا۔

قریب ہی سے تسلیخ بھری مدھم آواز سنائی دی بس۔ اور ایلی نے محسوس کیا جیسے اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا ہو۔ وہ ایک کیڑے کی طرح رینگ رہا تھا۔ رینگ رہا تھا پھر

سیاہ ہمدردانہ میرے نے اپنا دامن پھیلا کر اسے چھپا لیا۔

نائیٹ میر

”ایلی۔ ایلی۔“ آواز سن کر ایلی نے آنکھیں کھول دیں اورے میں کہاں ہوں۔ پھر علیٰ احمد کو دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھا۔ اس نے جیرانی سے چاروں طرف دیکھا اور اس غیر مانوس جگہ کو دیکھ کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ساتھ والی چار پالی پنہ ہمیں حرکت ہوئی اس نے اوہرہ دیکھا سا جو۔ فتناً اس نے محسوس کیا کہ وہ ننگا ہے اور کوئی ڈائن اس کا پیچھا کر رہی ہے اس کا مضائقہ اڑا رہی ہے۔ اور وہ بھاگ رہا ہے۔

سامنے افق پر بینِ مژگاں تھے ڈھکی ہوئی دو پنہ آنکھیں تھیں۔ سانوری انگلی سے گرا ہوا آنسو پوچھ رہی تھی۔ نہیں ایلی شریف مسکرا رہا تھا نہیں نہیں۔ محبت کرو چاہے کس سے کرو۔ کوئی بھی ہو لیکن محبت کرو۔ اور ایلی کا جی چاہتا تھا کہ شریف کے گلے سے لگ کر روئے۔

ایلی کے لیے وہ رات بھی انکے خواب یا نائم میر کی حیثیت رکھتی تھی جس کی یاد سے وہ لرز جاتا تھا۔ اسے محسوس ہوتا جیسے اس نے بہت بڑا جرم کیا ہو جیسے اس نے ہمیشہ کے لیے اپنے آپ کو قدر ذلت میں دکھل دیا ہو اور وہ تمخر اور تحقیر سے بھرا ہوا تھا۔ کیا یہی عورت کا قرب تھا کیا علیٰ احمد کو اسی قرب کا شوق تھا۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا؟ عورت کے قرب کا مطلب غلطت کے جو ہڑ میں ڈبکیاں کھانا نہیں ہو سکتا۔ نہیں نہیں۔

کئی ایک دن وہ اس نائم میر کے تاثرات میں کھویا رہا اس کے دل میں صرف ایک خیال تھا کہ وہ عورت کے قرب کے قابل نہیں اس میں وہ امیت ہی نہیں ورنہ وہ تمخر بھرا تھا جس کی وجہ سے وہ ایک کیڑے کی طرح رینگنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

نہیں نہیں۔ شریف کی آواز سنائی دی۔ یہ نہیں محبت کرو محبت پھروہ دیوانہ وار اوہرہ گھومتا کس سے محبت کروں۔ کیسے محبت کروں اور اس کے دل میں جستجو کی

ایک لہر رواں ہو جاتی۔

وہ بلوریں پاؤں واقعی اس قابل تھے کہ ان سے محبت کی جائے لیکن اسے اتنا بھی معلوم نہ تھا کہ وہ پاؤں کس کے ہیں۔ وہ کون ہے جو ان پا کیزہ پاؤں کی مالکہ ہے۔ اس نے کئی بار اسے دیکھنے کی گوشش [کمی تھی] مگر تنگ پا جامہ ایک سیاہ آنکھ اور دو بلوریں پاؤں کے علاوہ اسے کچھ دکھائی نہ دیا تھا۔

ان حالات میں محبت کرنا کیسے ممکن تھا اس بھی انکے خواب کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ اس کے دل میں عورت کے قرب کا خوف جاگنے لیے ہو گیا اور اپنی نا امیت کا خیال یقین کی حد تک مستحکم۔

بے زاری

دولت پور میں اب ایلی کی زندگی نے ایک مخصوص رنگ اختیار کر لیا تھا۔ اس کے صبح و شام ایک مخصوص ڈگر پر چلنے لگے تھے کالج اس کے لیے دیپسی سے خالی تھا۔ اگر چاہ وہ کالج جانے سے بالکل نہ گھبرا تا۔ لیکن اس کی توجہ تعلیم کی طرف مبذول نہ ہوتی تھی۔ اسے یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ تحصیل علم کرنا اس کے لئے ضروری ہے۔ ایلی کے لئے کالج مخصوص ایک تفریح گاہ تھی۔

کالج سے واپس آتے ہی وہ کتابیں گھر میں پھینک کر جمل کی طرف چلا جاتا اور وہاں کسی شغل میں مصروف ہو جاتا۔ گھر میں تو کوئی ایسی بات نہ ہوتی تھی جو اس کے لئے جاذب توجہ ہوتی۔

علی احمد حساب کا رجسٹر پر کرنے میں مصروف رہتے یا کسی نہ کسی بات پر شیم سے جھگڑا شروع کر دیتے۔ شیم دو ایک منٹ چینی چلاتی ہاتھ چلاتی اور پھر تھک کر رونا شروع کر دیتی۔ اسے روتا دیکھ کر اس کی دونوں بچیاں چینے لگاتیں اور گھر میں کھرام مج جاتا۔

راجو آجائی تو علی احمد کی حساب کتاب سے دچپی ختم ہو جاتی۔ رجسٹر بند کر کے وہ راجو کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ بات بات پڑھتے چھپھاتے۔ نہ جانے کیوں راجو کے آنے پر وہ بہانے شیم کو بلاتے اس سے کچھ اپوچھتے یا اس کی تعریف کرتے۔ شاید شیم کو نگ کرنے میں مزاح آتا ہو یا شاید اس کی وجہ ان کی ازلی تماش بینی ہو۔ راجو کو دیکھ کر غصے کی وجہ سے شیم کی آنکھوں کا فرق بے حد نمایاں ہو جاتا اور اس کی شکل و صورت بالا لکھی مضمون خیز ہو جاتی۔

بالآخر نین کا پا ہی قلع بند ہو جاتا اور شیم کا سب انتقام ملجنہ کمرے کی عقیبی کھڑکی میں لٹک جاتا۔ بند کمرے میں ریڑ کی گڑیا پیش اولئے کا پہلو ان گرتا اور پھر ایستادہ ہو جاتا پھر گرتا اور ایستادہ ہو جاتا۔ یا تالیاں پیشی تھیں گاتی۔ نیچے سڑک سے گزرتے ہوئے لوگ ان بامعنی تھیوں کو سن کر رُک جاتے پھر پنواڑی کی دوکان پر بات چل نکلتی۔

”ہاں میاں رونج آوے ہے اس چوبارے والے بابو کے پاس۔“

”ٹھیک کہے ہے یہ میں آپ دیکھے ہوں رونج یہاں سے کھرتے دے۔ یہاں آ کر آنکھیں جھکالے ہے میں نے کبھی نہیں جتایا۔“

”کیا کہا یہاں اس چوبارے مان۔ ارے نہیں بھائی عقل کی بات کرو۔“

”ارے مان کھوب جانوں یہ چوبارے والا بابو بڑا گھاگ ہے یہ بابو۔ چار رونج مان نچوڑ لیا اس نے اب وہ چلاوا پٹا خس ہے۔ چلاوا۔“

شام پڑتی تو راجو رخصت ہو جاتی اور علی احمد پھر سے رجسٹر کھول کر مصروف ہو جاتے۔ پھر جب رات کے آٹھ بجتے تو وہ آپ ہی آپ گلنگا نے لگتے۔ ”افوہ مجھے تو آج اسپکٹر صاحب نے بلا یا تھا۔ یا وہی نہ رہا۔ حافظہ کس قدر کمزور ہو گیا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ باہر جانے کے لئے کپڑے پہننے لگتے۔

چار ایک منٹ مل کھانے کے بعد شیم گویا اپنے آپ سے کہتی۔ ”جیسے میں جانتی

ہی نہیں ان کے اسپاٹر صاحب کو۔“

علیٰ احمد نہ پڑتے ”تو بالکل پلگی ہے راجو کی طرف جانا ہوتا تو چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔“

”تو باتانائڈ رجھی نہ ہو کوئی چوری اور پھر سینہ زوری شرم نہیں آتی۔“ شیم جواب دیتی۔

”بے موقوف شرم تو عورتوں کے لیے ہے۔“ وہ ہنسنے لگتے۔ ”مردوں کے لیے نہیں۔“

اس پر شیم خاموش ہو جاتی اور چھوٹے گھر کے سکیوں کی آواز آنے لگتی۔ ”بس میں بھی آیا۔“ کہہ کر علیٰ احمد باہر نکل جاتے اور پھر آدھی رات تک راجو کے یہاں پڑے رہتے۔ ان کی واپسی پر گھری دو گھنی تو میاں بیوی کی لڑائی ہوتی۔ شیم بات بڑھانے کی کوشش کرتی لیکن علیٰ احمد اسے چٹکیوں میں اڑا کے لیٹ جاتے۔

”ٹھیک ہے، وہ کہتے“ تو رُثنا چاہتی ہے تو میں ضرورتیری خواہش پوری کروں گا لیکن حق کی چلم پے بغیر رُثنا۔ نہ بھی یہ مشکل ہے تو ذرا چلم بھردے پھر رُثیں گے کیوں نہیں رُثیں گے تو چاہے اور نہم نہ رُثیں۔ بھی واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ اس پر شیم روتے ہوئے چلم بھرنے لگتی اور علیٰ احمد کپڑے بدلتے ہوئے گلنگا نے لگتے۔

گز شیخخت

جب بھی علیٰ احمد باہر جانے لگتے تو ایلی گھبرا جاتا کہ کہیں علیٰ احمد کو اسے ساتھ لے جانے کا خیال نہ آ جائے۔ ان کے ساتھ باہر جانے سے وہ ڈرتا تھا۔ اس مکان سے ڈرتا تھا جہاں اس نے وہ رات بسر کی تھی۔ اس سیاہ فام عورت سے ڈرتا تھا جس کا تحقیر بھرا تھا۔ اب تک اس کے کانوں میں گوشنا تھا۔ وہ اس قرب سے ڈرتا تھا جس کا وہ ایک بار سزاوار ہو چکا تھا۔

علیٰ احمد باہر جانے لگتے تو وہ گھبرا جاتا۔ راجوان کے گھر آتی تو وہ چپ چاپ

دے بے پاؤں باہر نکل جاتا۔ راجو کی زیر لب مسکراہٹ سے اسے ایسے محسوس ہوتا جیسے وہ ایلی کی گز شستہ خفت سے کما حلقہ والق ہو جیسے وہ جانشی ہو جانے بغیر بھتی ہو جیسے سا جونے اسے اس تمسخر بھرے تھے سمیت ساری بات بتا دی ہو۔ اس کی مسکراہٹ ایلی کے سینے میں دھار بن کر اتر جاتی اور وہ محسوس کرتا جیسے وہ کہہ رہی ہو۔

”اچھا تو جناب بھی اس میدان میں قدم رکھتے ہیں۔ وہ وہ بڑی خوشی ہوئی یہ جان کر۔“ اس پر وہ گر شستہ خفت از سر نواں پر طاری ہو جاتی۔ کبھی تو راجو کو دیکھ کر ایلی کے دل میں ایک عجیب سی وجہت بیدار ہو جاتی اور اس کا دل چاہتا کہ بڑھ لاس کی قمیض تارتا رکروئے اور پھر چلا چلا کر کہے ”میں تمہیں جانتا ہوں تم جونک ہو جو نک۔“ پھر وہ لا گول پڑھ کر اپنے آپ کو محفوظ کرنے کی کوشش میں کھو جاتا اور بالآخر چکے سے گھر سے باہر نکل جاتا۔ میڑھیاں اترتے ہوئے اسے شریف کی بنسی کی آواز سنائی دیتی۔ ”نہیں نہیں ایلی محبت کر و محبت۔“

تین را گیر

ایک روز راجو کے آنے پر جب وہ دے بے پاؤں میڑھیاں اتر رہا تھا تو علی احمد نے آواز دی ”ایلی۔ جانا نہیں۔“

وہ رک گیا اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ ”نہیں نہیں میں نہیں جاؤں گا۔“ میں ابا کے پاس نہیں جاؤں گا۔“

”ایلی اوھر آؤ۔“ علی احمد نے پھر آواز دی۔

راجو اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی ”اب تو نظر ہی نہیں آتا ایلی۔“ اس نے لاڑ بھرے انداز سے کہا ”جی نہیں چاہتا تیرا ملنے کو۔“ ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ بات طنز کہی گئی ہو۔

”ایلی ذرا ہمارے ساتھ چلنا ہے تمہیں۔ ابھی چلتے ہیں ذرا ٹھہر وہ۔“ علی احمد بو لے۔

”میں نہیں جاؤں گا۔“ ایلی نے بآواز بلند کہنے کی ناکام کوشش کی۔ اور پھر اپنی بے بسی پربل کھا کر خاموش ہو گیا۔

کچھ دیر کے بعد علی احمد تیار ہو گئے ”چلو ایلی“ وہ بولے اور پھر علی احمد، راجوار ایلی سیڑھیاں اترنے لگے۔ علی احمد اور راجو کے ساتھ دولت پور کے بازاروں سے گزرنا ایلی کے لیے بہت بڑی مشکل تھی۔ وہ حسوں کرتا تھا کہ پنواڑیوں کی دوکانوں پر کھڑے لوگ ان کی طرف دیکھدیکھ کر مسکراتے تھے۔ ان کے متعلق زیرِ لب باتیں کرتے تھے۔ اس وقت ایلی کی حیثیت سیلزین کی تھی ہو جاتی تھی۔ اسے یہ بات بے حد ناگوار گزرتی تھیں وہ کہاں کیا سکتا تھا۔ وہ تینوں راہ گیر عجیب انداز سے چلے جا رہے تھے۔

علی احمد کو تو لوگوں کی موجودگی کا احساس ہی نہ ہوتا تھا راہ چلتے ہوئے انہوں نے کبھی راگیروں یا پنواڑیوں کی طرف نگاہ اٹھا کر نہ دیکھا تھا۔ انہیں ادھر دیکھنے کی فرصت ہی نہ ہوتی تھی وہ تو گردن اٹھا کر چلنے کے حادی تھے اور ان کی گردن کا زاویہ ایسا ہوتا تھا کہ سڑک نگاہ سے اوچھل رہتی بلکہ مکانات کی ٹھنڈی منزل کی طرف دیکھنا ان کے لیے ممکن نہ رہتا اور دو روپیہ بننے ہوئے چوباروں یا کوٹھوں کی منڈیروں کی طرف دیکھتے ہوئے وہ آگے بڑھے جاتے۔ ان کے عقب میں راجو بر قعہ پہنچے ہوئے گرگابی بجا تی ہوئی یوں چلتی جیسے وہ دولت پور کی راجونہیں بلکہ کوئی اور ہی ہے اسے کوئی جانتا ہی نہ ہو۔ لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی اس کا سینہ تن جاتا قدموں میں شوٹی اہر اتی اور جالی کے پیچھے سے آنکھ لپکتی جیسے اس کا جی چاہتا ہو کہ ان آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے والے لوگوں سے کہے۔ ”میں ہی ہوں دولت پور کی پٹاخہ میں ہی ہوں کیا سمجھا ہے تم نے جہاں میرا جی چاہے جاؤں گی جس کے ساتھ جی چاہے رہوں گی کہ لوہیرا جو کرنا ہے۔“ اور دوسر پیچھے ایلی یوں چلا آتا جیسے بازار سے کوئی سودا

خریدنے کے لیے جا رہا ہوا اور اسے اس میلے بر قعے میں مبسوں ٹھک کرتی ہوئی عورت اور پوچھ بارہ نگاہوں والے مرد سے کوئی تعلق نہ ہو۔

اس روزان کے پیچھے چلتے ہوئے وہ دعا میں مانگ رہا تھا یا اللہ کہیں وہ اس گھر میں نہ جا رہے ہوں جہاں میلے پنڈے کی بوکے ریلے آتے ہیں اور وہ سیاہ گوشت میں میلے دانت وہ اس کے رو برو کیسے جائے گا نہیں غبیس۔
موڑ پر جا کر علی احمد رک گئے۔ ”اچھا راجو تو چل گھر۔ لیکن جلد اس جگہ پہنچ جائیو۔

سمجھی ہم انتظار کریں گے۔“ rights reserved © 2002
اچھا کہہ کر راجو چل گئی اور علی احمد اور ایلی مزکر دوسرا سرگ کو ہو لیے۔ کئی ایک راستوں سے ہوتے ہوئے بالآخر وہ ناؤں بال بیٹا واخل ہوئے جہاں لوگوں کا ہجوم تھا۔

بے بی شو

”آؤ ایلی آؤ۔ یہاں آج بے بی شو ہے۔“ علی احمد نے ایلی کی طرف دیکھا۔
”اے بے بی شو نہیں جانتے اور کہنے کو کافی میں پڑھتے ہو۔“ وہ ہٹنے لگے۔ واہ یہ بھی لا جواب بات ہے۔ دیکھو بے بی کا مطلب ہے بچہ۔ یعنی دو دھپٹا بچہ یعنی وہ بچہ جو ماں کا دو دھپٹا ہے آج یہاں ان بچوں کا شو ہو گا میوں پل بال میں جو بچہ سب سے زیادہ تقدیرست ہو گا اسے انعام ملے گا۔ یعنی یعنی۔“ وہ ادھر ادھر تاکتے ہوئے کہنے لگے۔ ”یہ بچوں کی نمائش ہے سمجھے اور سر کاریہ نمائش اس لیے مروج کر رہی ہے تاکہ لوگوں کی توجہ بچوں کی صحت کی طرف مبذول ہو۔ ہی ہی ہی۔“ وہ نہ جانے کس کی طرف دیکھ کر نہیں۔ اور پھر اپنا لیکچر شروع کر دیا۔

”ہاں تو کیا کہہ رہا تھا میں۔ ہاں بے بی شو۔ شو کا مطلب ہے۔ مظاہرہ مطلب دکھانا۔ سی یعنی المیں ڈبل ای۔ مطلب دیکھنا اور سی سے شو۔ یہ ناؤں ہے۔ سمجھے۔“ پھر خاموش ہو گئے۔

”ہاں تو کیا کہہ رہا تھا میں۔“ وہ پھر کسی طرف دیکھنے لگے۔

حفظان صحت اور زچ و بچہ کا پھر تو محض جملہ مفترض تھا۔ مطلب تو یہ تھا کہ اس احاطے میں کھڑے ہو کر باتیں کرنے کے بہانے اروگرد کے مجمع میں کسی کوتا کا جائے۔ ایلی محسوس کر رہا تھا جیسے بچوں کے بہانے وہ عورتوں کی نمائش ہو اور پھر دولت پور کی عورتیں بھی تو ایسی اچھی نہ تھیں ان میں وہ امیرتر اور لا ہور والی بات ہی نہ تھی۔ سیاہ رنگ کی دبلي پتلی عورتیں جن کے بانس نما ناگوں پر میلے شک پا جاموں کے غلاف چڑھے تھے اور ان کی گودیوں میں انسانی ڈھانچے لٹک رہے تھے۔

ہر جملے کے بعد علی احمد چاروں طرف دیکھتے اور ہر بر قعہ پوش کو زگا ہوں سے ٹوٹتے جیسے اسے قول رہے ہوں اور پھر پختے لختے۔

”ہی ہی ہی۔ تم افیٹ مارٹیٹی کو بھی نہیں جانتے تمہیں کالج میں پڑھاتے کیا ہیں وہ۔ وہ کھوہم تمہیں سمجھاتے ہیں۔“..... ”آئیے خان صاحب آئیے۔ کہنے مزاج کیسے ہیں۔“ وہ ایک اجنبی سے کہنے لگے۔ ”ہاں ہاں میں ایلی کو سمجھا رہا تھا کہ افیٹ مارٹیٹی کے کہتے ہیں بچے کو باتیں سمجھانے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اسے ایسے تھوار دکھانے جائیں۔ ہی ہی ہی۔ اور خان صاحب کے جانے کے بعد وہ مسکراتے ہوئے چاروں طرف دیکھنے لگے۔ ہاں تو کیا کہہ رہا تھا۔ میں یعنی مطلب ہے۔“

ایلی کو اچھی طرح معلوم تھا کہ مطلب کیا ہے اور وہ چاہتا تھا کہ چلا چلا کر لوگوں پر واضح کر دے کہ مطلب کیا ہے بلکہ خود انہیں بتاوے کہ وہ اچھی طرح سمجھتا ہے کہ مطلب کیا ہے۔

سفید و حبہ، بھوری لٹ

”ہاں میں تم ہو تسلیم۔ تم۔“ علی احمد ایک اجلے بر قعہ کی طرف بڑھے تم یہاں۔“ بر قعہ پوش گھرا کر گئی۔ ”تم نے مجھے پہچانا نہیں۔ ہی ہی ہی۔“ وہ ہٹنے لگے۔

”بھی میں علی احمد ہوں۔ علی احمد اپنے آغا صاحب اور میں دونوں ایک ہی دفتر میں تو
تھے۔ آج کل کہاں ہیں آغا صاحب۔“

”امر تر گئے ہوئے ہیں۔“ ایک باریک سی گھنی سی آواز سنائی دی۔ ”ہاں ہاں
امر تر ہی گئے ہوں گے انہوں نے خود مجھ سے کہا تھا ہی ہی ہی۔“

”پرانے دفتر سے چھٹی لی ہے کیا۔“

”استغفار سے دیا ہے۔“

”ہی ہی ہی۔“ وہ نہیں۔ ”ہاں ہاں استغفار پینے ہی کو تو کہتے تھے۔“

”اور تم یہیں ہوں گھی۔“

”ہم گھی جا رہے ہیں۔“ وہ بول۔

”اوہ تو تم بھی جا رہی ہو۔ اس سلسلے میں میرگی مدد کی ضرورت ہو تو بلا روک لوک
کہدو۔ آغا صاحب اور مجھ میں کوئی فرق نہیں ہمارے پرانے دوست ہیں اور پھر
خاندانی تعلقات ہیں ہی ہی ہی۔“

جھوٹ جھوٹ۔ ایلی کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے کوئی مکڑا اپنے
پنج پھیلا رہا ہو ہی ہی کے تار سے جال بن رہا ہوا اور مکھی قریب ہوئی جا رہی ہو
اور قریب۔۔۔۔۔

ایلی کو اس بات پر غصہ آ رہا تھا کہ علی احمد چھوٹی سی لڑکی سے بھی ہی ہی کیے
بغیر نہ رہتے۔ کتنی چھوٹی عمر تھی اس کی جب کہ وہاں علی احمد کے برادر کی عورتیں موجود
تھیں۔ پھر.....

شاید وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ لڑکی کسی نوجوان کی توجہ کے لاکچ تھی۔ پھر دفعتاً اسے
سارہ اور صبورہ یاد آ گئیں اور اسے علی احمد کی آواز سنائی دی۔ سارہ سو گئی کیا۔ ہی ہی۔
”شر ماں ہمیں تسلیم،“ علی احمد اسے بھر مار رہے تھے۔ ”ہاں ہاں بر قعہ اٹھا لو کیا حرج
ہے۔ ذر و نہیں۔ ہم جو تمہارے ساتھ ہیں۔“

دفعاً سفید رنگ کا ایک دھبہ ایلی کی آنکھوں نے ابھر اور گھنگھریا لے بالوں کی
ایک لٹاہرائی اور اس نے گھبرا کر نگاہیں پیچی کر لیں۔

علیٰ احمد کو تسلیم کی کلائی پر گھری باندھتے ہوئے دیکھ کر نہ جانے کیوں اسے شدید
صدماہ محسوس ہوا جیسے کوئی اس کا دل مسلسل رباہو۔ ایلی کی نگاہوں میں وہ نمائش و حندلی
پڑ گئی۔ بے بس غصے سے اس نے علیٰ احمد کی طرف دیکھا اور پھر مٹھیاں بھینچ کر چل پڑا
جیسے اس کے دل میں ایک عزم قائم ہو چکا ہو۔ جیسے اس نے ایک فیصلہ کر لیا ہو۔
”نہیں نہیں میں اسے سارہ نہیں بننے دوں گا۔ اس کی زندگی تباہ نہیں ہو گی۔
اسے اپنی عمر را ہبغا نہیں تیکا بس نہیں کرنی پڑے گی نہیں نہیں“ وہ چلا رہا تھا۔ اس
کے گرد لوگ شور چاہ رہے تھے۔ نات والے چالا رہے تھے۔ حور تین سینے سے بچے
چھٹائے بھاگی جا رہی تھیں لیکن اس سے دہن میں صرف ایک خیال تھا۔ ایک ارادہ
تھا۔ سامنے شریف مسکرا رہا تھا اس۔ ایلی ہاں۔ محبت کرو۔ چاہے کسی سے کرو لیکن
محبت کرو۔

اچھاتو

گھر پہنچ کرو وہ دھرام سے چار پائی پر گر پڑا غصے اور بے بسی سے اس کی آنکھوں
میں آنسو آ گئے۔ ان آنسوؤں کے وھندلے کے میں شریف تھیں بھری نگاہوں سے
اسے دیکھ رہا تھا۔ ”محبت کے بغیر تم کچھ بھی نہیں ایلی۔ کچھ بھی نہیں۔“

اجمل دفتر سے آیا تو ایلی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ”ایلی تم رو رہے ہو۔ علیٰ احمد سے
لڑائی ہو گئی کیا۔“
”نہیں تو۔“ وہ بولا۔

”تو کیا شیم نے کچھ کہا ہے۔“

”نہیں تو،“ ایلی کی اچکی نکل گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیوں رو رہا ہے۔
اس کی ہچکیاں کیوں نکل رہی ہیں۔ اس کی کوئی وجہ بھی تو نہ تھی، مگر اس کے باوجود وہ

چاہتا تھا کہ کسی کے کندھے پر سر کھکھرو دے اس کا دل چاہتا تھا کہ رازدارانہ انداز میں اجمل کو ایک طرف لے جائے اور اس سے کہے ”مجھے محبت ہو گئی ہے۔ اب میں کیا کروں۔“

ایلی بار بار کوشش کرتا کہ اپنی محبوبہ کے تصور میں کھوجائے لیکن ایک سفید سادھہ اور بھورے بالوں کی گھنٹریاں لٹ کے سوا کوئی اور تفصیل اس کے تصور میں نہ آتی بلکہ یہ تفصیل بھی دھنڈلی پڑتی جا رہی تھیں۔ کتنا پیارا نام تھا اس کا تسلیم۔ اور آواز۔ کتنی میٹھی کتنی دلی۔

ایلی کی باتیں سن گرا جمل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ”ہوں،“ اس نے ایک آہ بھر کر کہا۔ ”اچھا تو ایلی کو محبت ہو گئی ہے۔“ اتنا کہنے کے بعد وہ کسی خیال میں کھو گیا اور اس کی آنکھوں تلنے بخواہاں بلو ریں۔ تم خور ہو گیا۔ بخواہر قاصہ جو اس کے باپ کے داشتہ جانکی کی عزیزیہ تھی اور جسے اس نے کئی ایک سال آنکھوں کا تارا بنائے رکھا تھا۔ وہ نجوس کو بھلانے کے لیے اس نے بھرے کی خاک چھانی تھی اور کابل کی پہاڑیوں میں پناہ لی تھی اور جسے بھولنے کی شدید کوشش میں وہ اب تک ماحقہ چوباروں میں نہ جانے کس کی تلاش کیا کرتا تھا۔

کچھ نہیں سے..... بہت کچھ

اس حادثے کے بعد ایلی کا دولت پور میں رہنا قطعی طور پر ناممکن ہو گیا اس نے وہ آخری مہینہ بڑی مشکل سے گزارا۔ اب اس کی نگاہ میں علی احمد کی حیثیت ایک راکھش کی رہ گئی تھی جس کا کام صرف یہ تھا کہ سیتاوں کو اپنی لنگا کی جیونٹ چڑھاوے اور راجوسا جو تو غلیظ ڈھیروں کے سوا کچھ نہ تھیں۔ ان سے بات کرتے ہوئے ایلی کو گھن آنے لگ تھی۔

ابتدہ اب جب شیم عقبی کھڑکی کا سہارا لیتی تو ایلی کو غصہ نہ آتا بلکہ اس کے دل میں ہمدردی کی ایک لہر دوڑ جاتی بیچاری جو اس خوفناک لنگا میں بیکار بے مصرف مقید

تھی۔ جو جھوٹے سہاروں پر اپنی زندگی کے دن کاٹ رہی تھی جس کے لیے زندگی صح و شام کے تو اتر کے سوا کچھ نہ تھی۔

ایک ماہ کے لیے کالج میں امتحان کی تیاری کے لیے چھٹیاں ہو چکی تھیں ایلی کتابیں لے کر اجمل کے پینٹ پرپڑ جاتا۔ ایک گفتگو یا لٹ اس کی آنکھوں تکھتی۔ ایک سفید سا وحیہ چاند کی طرح چمکتا اور وہ چھٹت کی طرف گلکلی باندھ کر بیٹھ جاتا اور زگاہوں کو مست بنانے کی شدید کوشش کرتا چھٹت سے شریف کی متنبسم آواز آتی۔ ”تم محبت کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوا یا لی۔ کچھ بھی نہیں۔“ اور وہ محسوس کرتا کہ وہ بہت کچھ ہے بہت پچھ۔ پھر اسے امتحان دینے کے لئے اجلاری یاست میں جانا پڑا۔

ریاست اجلا

اجلا ایک ویران شہر تھا۔ جس میں یہاں وہاں آبادی کے گلڑے تھے۔ اور کہیں کہیں خوبصورت محل اور باغات تھے۔ اجلنے کا بڑا بازار کا ایک وسیع اور غلیظ کوچہ تھا جس میں سیاہ فام چست و چالاک قسم کے لوگ ادھرا دھر گھوٹتے پھرتے تھے۔ جن کی زبان کچھ کچھ چلتی اور جن کی آواز میں نہ تو دلی کی سی رنگینی تھی اور نہ لاہور کی سی مٹھاس۔ باتوں میں عجیب سی کرختگی تھی۔ انداز میں عمومیت سی تھی جس کی باتیں گویا ننگی تھیں۔ بھوٹڈی اور ننگی۔

اس بازادوں کے ادھرا دھر پرانی وضع کی بڑی بڑی عمارتیں تھیں۔ جن پر ویرانی اور اداسی چھائی رہتی تھیں اور جن کی اندر ہیری لمبی ڈیوڑھیوں میں اوپنے لمبے سپاہی بندوقیں اٹھائے پھرہ دیا کرتے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ ان پرانے محلوں میں مہاراج کی وہ رانیاں مقیم تھیں جو مہاراجہ کا چاؤ ختم ہو جانے پر ان محلات میں منتقل کر دی گئی تھیں اور زندگی کے باقی دن نوکروں اور اہل کاروں کی نگاہ اتفاقات کے سہارے بسرا کر رہی تھیں۔

ایلی محلات کے نوکروں کو سرت کی نظر سے دیکھتا۔ دفعتاً اسے مہاراج پر غصہ

آنے لگتا پھر علی احمد کی آواز سنائی دیتی۔ ”شرمنے کی کیا بات ہے تسلیم۔ ہم کوئی بیگانے تو نہیں۔“ ایلی کی نگاہوں نے ایک سفید و حبہ جھلما لاتا ایک بھوری لٹا لہراتی اور وہ آہ بھر کر آسمان کی طرف دیکھنے لگتا اور محسوس کرتا جیسے وہ بھی کچھ ہو۔

مہاراج

مہاراج کا موئی محل دیکھ کر ایلی سہم گیا۔ کتنے حسین کمرے تھے۔ کتنا خوبصورت ساز و سامان تھا ایلی کے لیے اتنی خوبصورتی اور فراوانی قابل حصول نہ تھی۔ زیادہ حالی شان چیزوں کو دیکھ کر اس کے دل میں ڈر سا پیدا ہو جاتا تھا ایک بوجھ سا پڑ جاتا تھا۔ شاہی حمام کو دیکھ کر وہ نجت رہ گیا۔ یہاں رانیاں اور مہاراج نہاتے تھے تالاب میں خوشبودار پانی بھر دیا جاتا تھا۔ پھر غلام گردش پڑوہ ایک دوسرے کو پکڑتے تھے۔ پھر جب اسے معلوم ہوا کہ یہ صیاں چڑھتے وقت مہاراج سہارا لیتے ہیں تو اس کے دل میں مہاراجوں کے خلاف بعض پیدا ہو گیا اور اس نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ دنیا کی فریبیوں کی شرافت اور محبت کی وجہ سے قائم تھی۔

واپسی پر سندھ محل کے دروازے کے قریب وہ رک گئے ان کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ کہ دروازے پر سنتری سے بات کریں۔

ظالم یا مظلوم

”کیوں بھئی یہاں کیوں کھڑے ہو۔“ سنتری نے لکارا۔
”بھی بھی۔“ ایلی بولا۔ ”محل دیکھنا چاہتے ہیں ہم۔“
”یہ محل نہیں دیکھا جاسکتا۔“ وہ بولا۔ ”مہاراج آرہے ہیں یہاں۔ اب بھاگ لو یہاں سے۔“

مجید جو ان سب میں شوخ طبیعت کا لڑکا تھا چلا کر کہنے لگا۔ ”وہ جو بوڑھا اور نوجوان اڑکی وہاں بٹھا رکھے ہیں۔“

تو اس نے اندر باغیچے کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ کیوں بیٹھے ہیں جی۔“

باغچہ کے اندر ایک کونے میں ایک بوڑھا اور اس کی نوجوان بیٹی چپ چاپ گھاس پر بیٹھے تھے۔

سنتری مسکرا یا ”تم کون ہو بھی“، ”وہ بولا“ ہندو ہو یا مسلمان، ”الحمد للہ“ مجید نے شوٹی سے کہا۔

سنتری قریب آگیا، ”تم نہیں جان سکتے یہ بات۔“ اس نے مسکرا کر رازدارانہ انداز سے کہا۔ ”یہ کام نہ تم کر سکتے ہونہ جان سکتے ہو۔ یہ بڑھا بڑی امید لے کر مہاراج کے دربار میں آیا ہے۔“ ”تو کیا یہ جو اس کے ساتھ لمندیا ہے اس کی امیدیں ہیں۔“ الاطاف نے اس گوری نوجوان لڑکی کی طرف دیکھ لکھا جس کی نکاح تھا تو اس کی امیدیں تو تھیں۔

”ہاں۔“ سپاہی ہنسا ”اس لڑکی کو اس نے ۱۲ سال تک گائے کا دودھ پلا پلا کر جوان دیا ہے۔ کہتا ہے میں نے لڑکی کے پنڈے پر حلوہ بامدھ بامدھ کر اسے پالا ہے اس امید پر کہ مہاراج یہ نذرانہ منظور کر لیں۔“

”اوہ۔“ مجید ہنسا ”تو نذریاز کا معاملہ ہے۔“ ایلی نے غور سے اس لڑکی کی طرف دیکھا جو عمر ہونے کے باوجود جوانی سے بھر پور تھی۔ ایلی سوچنے لگا کیا ہر مرد ایسا ہی ہوتا ہے۔ کیا عورت کے معاملہ میں ہر مرد ہی مہاراج ہوتا ہے۔ وہ۔ وہ کوئی تھی۔ وہ کوئی تو بھائی کو ملازمت دلوانے کے لیے آئی تھی اور پھر وہ خاتم تھی جسے وہ باداموں کی گٹھریاں دینے جایا کرتا تھا اور بالآخر جو۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ مہاراج ظالم تھا یا وہ بوڑھا باپ۔

ویرانہ

امتحان سے فارغ ہو کر وہ پھر علی پور آگیا اس کا خیال تھا کہ علی پور وہی علی پور ہو گا جہاں سے وہ چند ماہ پہلے گیا تھا جہاں بندرا بن کی رنگینی چھائی رہتی۔ کرشن کہیا باسری بجاتے اور سانوری کوٹھے پر ٹھہری تھی جہاں کپ چھلکتے تھے کیپ بڑے

طمطراق سے اپنی نمائش کرتی تھی اور کچھی حوصلی کی کہڑی لائیں کے نیچے علی پور کا جادوگر اپنا سامان لے کر انگرازی کا اسم اعظم پڑھتا تھا مگر اب کی دفعہ وہ علی پور کا پہنچاتو وہ ایک ویرانہ تھا۔ لق و دق ویرانہ۔

رنگ محل کی عمارت ویران پڑتی تھی شریف اور نیکم اپنے کنبے سمت واپس نور پور جا چکے تھے رنگ محل کے جنوبی حصے میں صرف رابعہ اور اس کا ناخا بیٹا سارہ مقیم تھے۔ مغربی حصے میں فرخت اور باجرہ رہتی تھیں شاہی میں اس کے ماموں حشمت علی اور ان کا بڑا بیٹا صغدر رہتے تھے حشمت علی پانچ وقت کی نماز پڑھنے اور قرآن کریم کی تلاوت کرنے میں مشغول رہتے تھے ان کا بیٹا پرانی یادوں کو باہر بار دل میں دہراتے اور ”حافظ خدا تمہارا“ کی وہ سن لایا پہنچنے میں معروف رہتا اور بھی کبھی اپنے نامے روپے تھیا کر چوری چوری شراب پینے کے شغل میں وقت بر کرتا تھا۔

پروین

رابعہ۔ سیدہ اور ان محل کی بہنیں تھیں۔ رابعہ کی شادی تو عمری میں اس کے خالہ زاد بھائی پروین سے ہو چکی تھی جو میڈیا یکل کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد فوج میں بھرتی ہو گیا تھا اور جس نے دوران تعلیم ہی میں حلقہ اسلام کو چھوڑ کر عیسائیت اختیار کر لی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ مذہب کی اس تبدیلی کا سبب کسی نوجوان لڑکی کا حسن و جمال تھا لیکن اس کے متعلق وضاحت سے کوئی بھی نہ جانتا تھا۔ کیونکہ پروین کی زندگی ایک پراسرار معہمند کر رہ گئی تھی۔ وہ ماں باپ کا بے حد لاؤ لاتھا اسی وجہ سے باپ نے اسے اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی حالانکہ وہ صاحب حیثیت شخص نہ تھے۔ پھر بھی انہوں نے بیٹے کی ہر بات پوری کی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ پروین متوسط درجے کے والدین کا بیٹا ہونے کے باوجود فیشن سبیل حلقوں میں رہنے کا عادی ہو گیا اور ہمیشہ کے لیے اپنے عزیزوں کی سی عالمیانہ زندگی بس کرنے سے نجات حاصل کرنے کی غرض سے اس نے عیسائیت اختیار کر لی تھی۔

پروین کی تبدیلی مذہب گھروں کے لیے ایک گھرا صدمہ تھی اس کی والدہ نے اس خبر کو سنا اور یوں خاموش ہو گئی جیسے کسی اتحاد سمندر میں ڈوب گئی ہو۔ والدہ نے تو وہ اضطراب سے ادھر ادھر ٹھلنے لگے۔ نہیں نہیں۔ ”وہ چلائے۔“ ایسا نہیں ہو سکتا۔ نہیں پروین ایسا نہیں۔“ اور پھر جب انہیں بھیں ہو گیا کہ خبر درست ہے تو انہوں نے پہلو بدلا۔ ”عین حالی ہو گیا تو کیا ہوا۔“ انہوں نے ہشنے کی ناکام کوشش کی۔ ”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ مگر ان کے انداز سے واضح تھا کہ فرق پڑتا ہے۔ ایسا فرق جو ان کے لیے قابل برداشت نہیں۔

پروین کے متعلق یہ خبر اس کی بیوی رابعہ نہیں تو اس نے لپک کر تنخے سارہ کو اپنی گود میں اٹھالیا اور جیدائی سے چاروں طرف دیکھنے لگی جیسے کوئی ہو۔ رابعہ نوجوان تھی حسین تھی اور زندگی کی راہ میں ابھی نہ آموز تھی۔

رابعہ کو دیکھ کر ایلی کو پروین پر غصہ آنا شروع ہو جاتا اور وہ سوچنے لگتا کہ ضرور پروین کے ساتھ کوئی ایسا واقعہ پیش آیا ہو گا جیسا سارہ کے ساتھ آیا تھا اور نہ عیسائیت کا سہارا کیوں لیتا۔

کیا ہے تجھے

سارہ کا خیال آتے ہی اسے علی احمدیا دا آ جاتے اور پھر بے بی شوکا وہ میدان دکھائی دیتا اور ایک اجلے بر قعہ الٹ کی اس کے روپ و آکھڑی ہوتی۔ ایک سفید دھبہ ایک گھنٹھریاں لٹ۔ پھر وہ چپ چاپ گھر جا کر بیٹھ جاتا اور دادی اماں پوچھتی ایلی کیا ہے تجھے کیا ہو گیا ہے۔ کیا بات ہے۔ ایلی۔ ایلی کو خود بھی معلوم نہ تھا کہ اسے کیا ہو گیا تھا۔

محلے کا احاطہ پیران پڑا تھا اس لئے کہ ارجمند نہ جانے کہاں کس نوکری پر چلا گیا تھا اور انگرائیڈی کا کھیل ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی ایلی گھبرا کے ارجمند کے گھر چلا جاتا جہاں تخت پر ارجمند کی بانسری پڑی دیکھ کر اس کا دل بھر آتا۔ یا کسی

وقت جب وہ نگاہ بچا کر مقابل کے مکان کی طرف دیکھتا اور وہاں ہکوری ڈکوری کا کوئی ایڈیشن نظر آتا تو دل پر ٹھیس لگتی۔ پھر وہ کچی حوصلی کی کبڑی خمیدہ لائیں تلتے چلا جاتا لیکن وہاں کھڑے ہونا تو بالکل بیکار تھا۔ اگرچہ کیپ فوراً کھڑکی میں آ کھڑی ہوتی اور مسکرا کر کسی نے کسی نے با آواز بلند باتیں کرنے لگتی لیکن ایلی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہے کس طرح ہاتھ ہلانے، رومال ہلانے وہاں بت کی طرح بے حس و حرکت کھڑنے رہنا بھی تو بے معنی بات تھی اور پھر لوگ۔ پھر وہ رضا کی دوکان پر جا بیٹھتا اور رضا سے وچھپے باتیں سناتا اور ہر آتے جاتے کوچھیزتا اور بالآخر ایلی پُر فقرے کئے شروع کر دیتا۔ ”ہوں تو ایلی بابو کو محبت ہو گئی ہے۔“ بڑا خطرناک مرض ہے یہ۔ اللہ ہی بچا نے والا ہے وہ نہ ایسے مریض چھپے نہیں۔“ اور ایلی کو اس کی باتوں کے علاوہ اپنی حماقت پر غصہ آتا کہ اس نے اپنی محبت کی بات رضا کو کیوں بتا دی تھی مگر رضا کو بتائے بغیر چارہ بھی تو نہ تھا علی پور میں اور کون تھا جس سے وہ راز دل کہہ سکتا تھا۔ صرف ایک رضا تھا۔ رفیق بھی تو نوکری کے سلطے میں کہیں جا چکا تھا۔

جمیدہ رسیدہ

محلے میں اس کے لیے دچپی کی کوئی صورت نہ تھی گھر میں بوڑھی دادی کے سوا کوئی نہ تھا۔ سیدہ تو بالکل ہی خاموش رہا کرتی تھی۔ وہ ہر وقت دادی اماں کے ساتھ چپ چاپ بیٹھی رہتی تھی۔ جوان ہونے کے باوجود وہ ازلی طور پر بوڑھی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا خاوند اس کی پروانہ کرتا تھا۔ کبھی کبھار سال و سال کے بعد رات کے اندر ہیرے میں وہ چپ چاپ آ جاتا پھر اگلی صبح جب ایلی بیدار ہوتا تو اسے خبر ملتی کہ فاضل صاحب آئے ہوئے ہیں وہ دوسرے ہی اسے دیکھتا۔ سیاہ فام بھاری بھر کم سامرد جس کے بال کالے ہونے کے باوجود سفید و کھائی دیتے تھے اور جس کی جھکی ہوئی کمر سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ شانوں پر صدیوں کا بوجھا اٹھائے ہوئے ہو۔ وہ دھیمی آواز میں باتیں کرنے کا حادی تھا یہاں تک کہ گھروالوں کو اس کی کسر پھر

سے اندازہ نہ ہو سکتا تھا کہ وہ آپس میں محبت بھری باتیں کر رہے ہیں یا ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں البتہ جب کبھی ایلی اس کے پاس جاتا تو وہ ایک نا ایک دلچسپ بات شروع کر دیتا اور ایلی کو یقین نہ آتا کہ اس شکل و صورت کا شخص ایسی چمکیلی اور دلچسپ بات بھی کر سکتا ہے۔

ایلی کے گھر میں سیدہ کے علاوہ سیدہ کی مرحوم بہن نیاز کی بیٹیاں حمیدہ اور رشیدہ بھی رہتی تھیں اگر وہ تو بالکل بچیاں تھیں۔ حمیدہ اور رشیدہ کا ایک بھائی بھی تھا جس کا نام نقی تھا اور جس کے چہرے پر بہت بڑا غم تھا۔

حمیدہ اور رشیدہ کے آئتے ہے ایلی کو چند ایک سہولیات ضرور حاصل ہو گئی تھیں کیونکہ اسے دو چھوٹی بہنیں پیدا ہو گئی تھیں جو ان کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں معروف رہتی تھیں اور اس کا کام کرتے ہیں میں حقیقی سرست محسوس کرتی تھیں مگر ان باتوں کے باوجود اسے گھر رہنے میں کوفت ہوتی تھی اور وہ ہر ممکن موقع پر رضا کے پاس جا بیٹھتا اور رضا اسے اداں دیکھ کر کہتا۔ ”آؤ تمہیں گھما لا گئیں۔ کیا یاد کرو گے بالبو۔“

وہ اپنی لائھی سنیحال کے ساتھ ہو لیتا اور جب وہ علی پور کی فصیل کے باہر چکر لگالگا کر تھک جاتے تو وہ اسے پہلوان اور طفیل کے پاس لے جاتا۔ پہلوان اور طفیل آصفی محلے کے پڑوں میں رہتے تھے پہلوان ایلی کو دیکھ کر مسکراتا۔ ”آئیے بالبو جی۔“ اور پھر اپنی تمام تر مخصوصیت کو لیے ہوئے بیٹھا مسکراتا رہتا۔ طفیل ایک دبلا پتلا لڑکا تھا جس کی طبیعت میں رنگی اور تیزی دونوں عنصر موجود تھے۔ وہ دونوں ایلی کے ساتھ بڑی محبت اور عزت سے پیش آتے تھے اور ایلی محسوس کرتا تھا جیسے وہ ایک بلند و پرتر ہستی ہو۔ پھر وہ شیخ ہدم کی طرف جا بیٹھتے جو چڑے کا سودا گرفتھا۔

شیخ ہدم

پہلی دفعہ شیخ ہدم کو دیکھ کر ایلی بہت متاثر ہوا تھا۔ شکل و صورت سے معزز و دکھائی

دینے کے باوجود اس کے خیالات نوجوانوں کے سے تھے اور طبیعت میں بلا کی چمک تھی۔ شیخ ہدم پہلا شخص تھا جو عمر اور مرتبے میں بڑا ہونے کے باوجود ایسی سے دوستانہ حیثیت سے ملتا تھا۔ ”آئیے الیاس صاحب“ وہ اسے دیکھ کر مسکراتا ”تریف رکھیے یہاں لگھرانے کی کوئی بات نہیں بس چار ایک منٹ میں سودا ہو جائے گا اور پھر بیٹھ کر لپ اڑائیں گے۔ ”ہاں جی چودھری جی۔“ وہ اپنے گرد بیٹھے ہوئے بیوپارلوں سے کہتا۔ ”بس جو کہہ دیا ہے نا میں نے وہ عین مناسب ہے۔ آپ بھی کیا یاد رکھیں گے چودھری صاحب۔ سو کے پیچے ایک آنہ اور سہی۔“ بس چودھری صاحب اب تو مطمئن ہو جانا چاہئے آپ کو ٹھیک ہے ٹھیک ہے اچھا تو سلام علیکم ہاں جی الیاس صاحب۔ تو رہنمی کی شرطی کی بازی۔ مگر ابھی تو آپ ناچنتے ہیں اس فن میں بہر حال چلتے۔ ہو ہی جائے ایک بازی۔ ہاں کیا پیش گے آپ نہیں چلتے تو وابیات ہے۔ اولٹ کے دودھ والے۔ آدھ سیر دودھ میں چار پیڑے بلوکر لانا۔ ذر بالا لائی زیادہ ڈالنا۔ الیاس صاحب بھی کیا یاد کریں گے کہ کسی شیخ سے پالا پڑا تھا۔ باہو الیاس صاحب دودھ پیجئے۔ بالائی کھائیے اور روزش کیجئے ورزش۔ یہی عیش ہے آپ کی قسم۔ ہاں تو کہنے کیسی گزرتی ہے آج کل۔“

شیخ ہدم میں زندگی تھی۔ جوانی تھی اور اس کے علاوہ وہ معز زشہری سمجھے جاتے تھے اور یہ سب باقیں علی پور میں ایلی کونسیب نہ تھیں گھر اور محلے والے اسے کھلانڈرہ لڑکا سمجھتے تھے اور بس وہ اس قابل نہ تھا کہ اسے کوئی اہمیت دی جائے۔ اس میں ڈنی چمک تو تھی مگر وہ ڈر اور خوف کے دیزیز پر دوں میں دم توڑ رہی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خود کفیل نہ تھا جیسے کہ شیخ ہدم تھے۔ جب شیخ ہدم اسے الیاس صاحب کہتے تو وہ خوشی سے پھولانہ سما تا اور اسے محسوس ہوتا کہ وہ بھی ایک حیثیت کا مالک ہے باعزت فرد ہے ایک ایسا شخص جو بالغ العقل ہے۔

ان باتوں کے باوجود ایلی زیادہ دریتک شیخ ہدم کے پاس نہ بیٹھ سکتا تھا کیونکہ جلد

ہی اس پر احساسِ کمتری چھا جاتا اور وہ وہاں سے چلے آنے کا کوئی نہ کوئی جواز پیدا کر لیتا۔ گھر آ کروہ چارپائی پر لیٹ جاتا اور شریف کی سی آنکھیں بنا کر چھت کو گھورنے لگتا چھت پر ایک سفید سادھبہ چمکتا اور ایک بھوری لٹکتی دو سیاہ آنکھیں ڈلتیں۔ بار بار آہیں بھرتا اور پہلو بدلتا اور محسوس کرتا کہ زندگی ایک مسلسل کوفت ہے ایک دھھری کیفیت۔

نتیجہ

ایلی کا نتیجہ کلا تو وہ فیل تھا۔ اس خبر کو سن کر اسے بہت صدمہ ہوا لیکن اس نے اپنی تعابی ناکامی کو الی کی چاکر بدھتی سے ناکامی محبت کی طرف منتقل کر دیا کہ اسے فیل ہونے کا کوئی صدمہ نہ ہاڑوہ اس بھی ہوئی لٹ اور پر پیچ ہو گئی اور اس سفید وہبے میں دل کے خون کی ہلکی سرخی شامل ہو گئی۔

نتیجہ کے اعلان کے بعد علی احمد کا ایک خط موصول ہوا جس میں ایلی کو مختصر طور پر ہدایت کی گئی تھی کہ وہ امر ترجا کرایڈ ورڈ روڈ پر روشن لال سے ملے خط میں علی احمد نے یہ نہ لکھا تھا کہ یہ روشن لال کون تھے اور ان سے ایلی کو ملانے کا مقصد کیا تھا۔ ایلی صرف اس حد تک سمجھ سکا تھا کہ روشن لال علی احمد کے دوست تھے اور انہوں نے کسی بھی کام کے لیے اس سے روشن لال سے ملنے کو کہا تھا۔

ایلی کو معلوم نہ تھا کہ روشن لال امر ترجا آریہ کانج کے پرنسپل تھے اور علی احمد کا مقصد اس ملاقات سے صرف یہ تھا کہ روشن لال ایلی کو امر ترجا آریہ کانج میں داخل ہونے پر رضا مند کر لیں اور وہ لاہور میں آوارگی کرنے سے محفوظ ہو جائے انہیں معلوم نہیں تھا کہ ایلی کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ وہ امر ترجا کے وہاں ایک سال رہنا تو بہت بڑی خوش نصیبی تھی۔ شاید انہیں بے بی شوکا وہ معمولی واقعہ یاد ہی نہیں رہا تھا ان کی زندگی ایسے واقعات سے بھری پڑی تھی اس لیے انہوں نے اسے چند اس اہمیت نہ دی تھی۔ لیکن ایلی کے لیے اب بے بی شوکا وہ دن ایک تاریخی دن تھا

ایک ایسا دن جسے وہ بھی فراموش نہ کر سکتا تھا۔

پر پل

روشن لال خوش شکل اور جوان قسم کے آدمی تھے ان کے بشرطے سے فہانت اور بے تکلفی پہنچتی تھی۔

”ہوں.....“ وہ بولے۔ ”تو تم علی احمد کے لڑکے ہو۔ جانتے ہو علی احمد میرے دوست ہیں لگو یہ دوست۔ مگر تم لکھرا کے ہوئے کیوں ہو۔ علی احمد کے بیٹے کو گھبراانا زیب نہیں دیتا۔ بیٹھ جاؤ چاہے پیو گے نا۔ اوہ تو تم ہیں مجھ سے زیادہ ان شہری مچھلیوں سے وچپی ہے۔“ ایلی کو باور کے مرتبان میں تیرتی ہوئی مچھلیوں کی طرف گھورتے ہوئے دیکھ کر وہ بختنے لگے۔

”اچھا تو الیاس یہ بتاؤ کہ جب مرتبان کا پانی گندہ ہو جائے اور مچھلیوں کو تازہ پانی بھی پہنچانا ہو یعنی مرتبان کا پانی بد لانا ہو تو کیا کریں گے۔“

ایلی سوچنے لگا ”ہاں ہاں سوچ لو۔“ وہ مسکرا کر بولے۔ ”مگر کوئی ایسی بات بھی نہیں۔ سامنس پڑھی تھی ناتم نے دوسویں میں۔“

ایلی ان کی بے تکلف باتیں حیرانی سے سن رہا تھا اس کا تو خیال تھا کہ روشن لال اسے کوئی ضروری پیغام دیں گے اور بزرگانہ انداز میں کچھ فرمانے کے بعد یہ ملاقات ختم ہو جائے گی مگر وہ تو اس سے یوں باتیں کر رہے تھے جیسے وہ علی احمد کی بجائے خود ایلی کے دوست ہوں۔

”اچھا تو الیاس تمہارے مشاغل کیا ہیں؟“ وہ پوچھنے لگے۔ ”سناءہ فی الحال فیل ہونا تمہارا مشغل ہے جب میں تمہاری عمر میں تھا تو میرا بھی یہی شغل تھا۔ کئی ایک سال میں کامیابی سے فیل ہوتا رہا۔“

ایلی حیران تھا کہ انہیں کیا جواب دے وہ بڑے شوق سے ان کی باتیں سن رہا تھا اور مسکرا رہا تھا ”اچھا بھی“ بالآخر وہ بولے۔ ”اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو ہم تمہیں

اپنے کالج میں داخل کر لیں۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔
کیوں۔“

”آپ کا کالج،“ ایلی نے خوشی سے پوچھا۔

”ہاں ہاں۔“ وہ بولے۔ ”ایک چھوٹا سا کالج ہے اور اسے چلانا میرے ذمہ
ہے تم ایسے لڑکے اگر میرے کالج میں داخل ہو جائیں تو میرا چھا ہو۔“

”بھی ہاں۔“ ایلی خوشی سے جھوم گیا۔ ایک قمر امر تر اور پھر روشن لال صاحب
اس سے بہتر صورت کیا ہو سکتی تھی اور وہ داخل ہونے کا وعدہ کرنے کے چلا آیا۔

ہال دروازے پر پیش کر رفعتاً سے خیال آیا کہ یہ بیان رہتی ہے اس شہر میں ان
نگوں میں پہنچتی ہو گی اس نے بازاروں میں جتے ہوئے نگوں کی طرف دیکھ کر سوچا۔
ان ہڑکوں پر چلتی پھرتی ہو گی کتنی خوشی نصیب ہیں یہ ہڑکیں یہ راستے یہ تانگے یہ ہوا۔
ایک سفید سادھہ اس کی نگاہوں میں چمکنے لگا اور گھنٹھریاں لٹ لہر الہا کر اسے
بالانے لگی۔ اللہ کرے اباروشن لال کی تجویز مان لیں اور میں امر تر کالج میں داخل ہو
جاوں۔ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ تجویز تو خود علی احمد کی تھی جسے روشن لال نے اپنی
جانب سے پیش کیا تھا تا کہ ایلی کو یہ احساس نہ ہو کہ اسے امر تر میں داخل ہونے پر
محجور کیا جا رہا ہے۔ اور وہ لا ہور میں داخل ہونے کا مطالبہ نہ کرے۔

دس دن کے اندر اندر علی احمد کا خط موصول ہوا جس میں اسے امر تر میں داخل
ہونے کی اجازت دے دی گئی اور وہ اپنا مختصر سامان اٹھا کر امر تر آ پہنچا اور آ ریا
کالج میں داخل ہو گیا اور پہل روشن لال نے اسے بورڈنگ میں داخل ہونے کی
خصوصی اجازت حاصل کر دی کیونکہ وہاں مسلمان لڑکوں کو رہنے کی اجازت نہ تھی۔

آم اور سانپ

بورڈنگ شہر سے بہت دور نہر کے کنارے آموں کی کوٹھی میں واقع تھی۔ آموں
کی کوٹھی ایک ویران جگہ تھی زرور نگ کی یہ پرانی عمارت چاروں طرف سے آم کے

درختوں میں گھری ہوئی تھی جہاں رات بھر زمین پر سانپ ریگتے اور دن بھر الیوتا۔
مغرب کی جانب ایک کچی سڑک تھی جس کے پرے امرودوں کا ایک باعث تھا جنوب
کی طرف نہر بہتی تھی اور باتی دونوں طرف ویران زمین تھی۔

کوٹھی سے ایک پختہ سڑک شہر کی طرف انکل گئی تھی۔ سڑک کا یہ ویران گلزار دو
فرلانگ لمبا تھا جس کے دونوں طرف اوپر لے بے درخت لگے تھے اور وہ اتنے گھنے
تھے اور تعداد میں اس قدر زیادہ تھے کہ اچھی خاصی جگہ کی شکل بن گئی تھی۔ سڑک
کے اس ویران گلزارے سے پہلے کمپنی باعث اور مخند کی کھوئی تھی۔

اڑتے چلکے

بورڈنگ میں تقریباً بارہ تیہہ کمرے تھے جن سے ہٹ کر دو کمرے تھے جو
باور پی خانے کے لیے مخصوص تھے جن میں چار ایک غلیظ باور پی اور نو کر ہر وقت
کام کاج میں مصروف رہتے تھے۔ کوٹھی کے مشرق میں دو بڑے کمرے بنگالی
پروفسر بیزرجی کے لیے مخصوص تھے جو بورڈنگ کے سپر غنڈٹھ تھے اور اکثر چوری
گھر میں مجھلی پاکا کر کھایا کرتے تھے کیونکہ بورڈنگ میں مجھلی اور اٹھا پکانا قانونی طور
پر منع تھا۔ بورڈنگ کے باور پی خانے میں آلوسائگ بھنسے ہوئے ٹینڈے بینگن کا
بھرتہ اور دالیں پکتی تھیں۔ رسولی کے باہر ایک لمبی میز پڑی تھی۔ یہ میز اڑکوں کا
ڈائینینگ ہال تھی۔ بندو باور پی چھوٹے چھوٹے چلکے پاکا کر انہیں باور پی خانے سے
پر اسرار رکا ہیوں کی طرح ہوا میں پھینکتا اور باہر میز پر بیٹھے ہوئے اڑ کے انہیں
دیکھتے۔

”بندو پھلاکا۔“ رام لال چلاتا اور بندو ایک زرد زرد سا پھلاکا فضا میں چھوڑتا جو
رام لال کے ہاتھوں میں آگرتا۔ ایلی بندو کی چستی اور نشانے پر حیران رہ گیا۔ وہ
منظر عجیب تھا۔ باور پی خانے کے باہر سفید زمین پر ایک لمبی غلیظ میز پر دس بارہ
لڑکے کٹوریاں سامنے رکھے بیٹھے تھے اور بندو کے چلکے کبوتروں کی طرح ہوا میں اڑ

رہے تھے۔

”بندو پھالا“ اور ایک ساعت میں ایک پھالا پکارنے والے کے ہاتھ میں آ

گرتا۔

”بندو وال“، ایک رکا چینتا اور بنتا ایک کشوری لے کر بھاگتا۔

ایلی کے لیے کھانے کی میز کا یہ منظر بالکل نیا تھا۔ نیا اور انوکھا۔ لیکن اسے اجازت نہ تھی کہ وہ اس میز پر بیٹھے کیونکہ وہ مسلمان تھا اور مسلمان کے لیے جز لٹیبل پر بیٹھنا منع تھا اس کے لیے کچن کے برتوں کو استعمال کرنا منوع تھا۔ خوش فرمتی سے اس سال بورڈنگ میں وہ اور مسلمان لڑکے داخل ہو گئے تھے جنہیں خصوصی وجوہ کی بناء پر وہاں رہنے کی اجازت مل گئی تھی اور ان تینوں کا فرض تھا کہ یا تو وہ سب سے پہلے کھانا کھائیں اور یا سب کے بعد اور یا مرے میں بیٹھ کر جب جی چاہے کھائیں بشرطیکہ اس وقت کوئی نو کرفار غ ہو جوان کے لیے کھانا لاسکے۔

کٹوریاں

نوکران زرد کٹوریوں میں کھانا لے آتا اور پھر کٹوریوں میں انگلیاں ڈال کر بڑی بے تکلفی سے ڈال یا سبزی ان کے ذاتی برتوں میں اندھیل دیتا۔ اس عمل کے دوران میں وہ احتیاط رکھتا کہ اس کے جسم کا کوئی حصہ ان کے برتوں سے چھوکر بھر شد نہ ہو جائے اور پھر وہ تینوں باری باری چلا تھے۔ ”بندو پھالا“ اور سچلکے ہوا میں اڑتے اور برتن بجھتے اور وہ تینوں ایلی شفیع اور مولا دا ڈشور مچاتے۔

ہفتے کو سر شام ہی سے کچن سے باہر دودھ کی بڑی بڑی گاگریں قطار میں پڑیں دکھائی دیتیں۔ نہ جانے وہ گاگریں کہاں سے آتی تھیں۔ شام کو ہر آدھ گھنٹے بعد کوئی مہر اسر پر گاگر اٹھائے تیزی سے نیم چلتا نیم بھاگتا ہوا آتا دکھائی دیتا۔ اس کا جسم میل سے بھرا ہوتا۔ ہاتھوں کی انگلیاں گاگر میں ڈولی ہوئی ہوتیں اور کہنیوں تک بازو دودھ میں تر ہوتے دودھ کی چھلکتی ہوئی گاگر لیے وہ بھاگا آتا اور پھر بستے یارامو

کی مدد سے گاگرا تاری جاتی۔

ہفتے کی رات بندو بڑے بڑے کڑا ہے چوہوں پر رکھ کر آگ جلا دیتا اور پھر رات بھر ان کڑا ہوں میں چجچہ چلانے کی آوازیں آتیں اور بندو باری باری بستنے اور رامو کو ڈالنٹا۔ اگے روز بڑی بڑی زرد تھائیوں میں گھیر ڈال دی جاتی اس پر اڑ کے خوشی سے پھولے نہ سمجھاتے اور پھر میز پر بیٹھ کر کھیر بھرئی انگلیاں چاٹتے۔ اس روز بندو کے چکلے ہوا میں نہ اڑتے اور کٹوریاں باور پیچی خانے کے ایک کونے میں ڈھیر کر دی جاتیں۔

معزز آدمی

شفع۔ مولا دادا اور ایلی یور فنگ کے ایک علیحدہ کمرے میں رہتے تھے۔ شفع پتلا دبلا اور از قدر کا تھا جس کے خدو خال سے چستی اور ذہانت پیکتی تھی۔ اس کے والدین امر تر کے قریب ہی کسی گاؤں کے زمیندار تھے۔ مولا دادا کوتاہ قد اور جسم تھا۔ خدو خال سے وہ کالج کالج کا معلوم ہی نہ ہوتا تھا اور گفتگو سے ظاہر ہوتا تھا جیسے کسی گاؤں کا جاث بھول کر شہر میں آنکلا ہو۔ اس کالباس بھی عجیب تھا۔ کم از کم ایلی کے لیے تو وہ لباس بہت ہی انوکھا تھا اس کے لباس کو دیکھ کر پہلے روز ہی پر پسل نے اسے دفتر میں پالایا اور کہنے لگے۔

”مولادا یہ کیا حیلہ بنایا ہے تم نے۔“

”حیلہ“ مولا داد نے حیرانی سے دیکھا اور پھر ٹھوڑی پر ہاتھ پھیر کر بولا ”پر پسل صاحب میں تو اپنے گاؤں کا ایک معزز آدمی ہوں اور جناب حیلہ تو مجرموں کا ہوتا ہے۔“ مولا داد کی آواز اور انداز میں ایک خاص قسم کی بنجیدگی اور معصومیت تھی۔

”نہیں۔ نہیں یہ تھہ بند کالج میں نہیں چلے گا۔ کوئی شلووار نہیں ہے تمہارے پاس پہننے کے لیے۔“

”مل جائے تو پہن لوں گا۔“ وہ بولا۔

اس پر پرپل نے کسی فنڈ سے اسے دو شلواریں سلوادی تھیں۔ اس کے بعد بورڈنگ سے چلتے وقت مولا دا ایک شلوار اخبار کے کاغذ میں لپیٹ کر لے جاتا۔ جب کالج کی گھنٹی بجتی تو وہ تمہے بنداتا رکر جھبٹ شلوار میں داخل ہو جاتا اور جماعت میں جا بیٹھتا جہاں خالی پیریں آتا تو وہ شلوار کاغذ میں لپیٹ لیتا اور تمہے بند باندھ کر اطمینان کا سامنہ لیتا۔

”بھئی اب کرو بات۔“ وہ چلاتا۔ ”یا راس شلوار میں تو دم گھٹتا ہے۔“

کوئی نہیں جانتا تھا کہ مولا دا کہاں کا رہنے والا تھا اور کہاں سے آیا تھا اس نے کبھی اپنے گاؤں اور والدین کا ذکر نہ کیا تھا البتہ اسے جیب خرچ بہت کم ملتا تھا اور اس کے زیادہ تر اخراجات کالج والے خود ادا کیا کرتے تھے کیونکہ وہ کرکٹ کا ایک نہایت عمدہ کھلاڑی تھا اور بامیں باٹھے لگھی گیند چھیننے کی وجہ سے کالج والے اس کی ہزت کیا کرتے تھے۔

شفق یا تو سانپ مارنے کے شوق میں ادھر ادھر گھومتا پھرتا اور یا یا کی کھینے کے متعلق گپیں سناتا رہتا۔ مولا دا تمہے بند جھاڑتا اور عجیب و غریب منصوبے بناتا رہتا۔ پہلے ہفتے میں اس نے لنگوٹا باندھ کر جڑے پر رومال باندھ کر ہاتھ میں لٹھے لیا اور رات کے وقت مرٹک پر آتا دکھائی دیتا تو وہ لٹھے کر درختوں سے باہر نکل آتا۔

رکھ دے یہاں جو بھی تیرے پاس ہے وہ ڈاکوں کر انہیں ڈانٹا۔ اس طرح پہلی رات اس نے کئی پنسلیں۔ چاقو۔ گھریاں اور سات روپے بارہ آنے نقد جمع کر لیے تھے اور بورڈنگ کے لڑکوں کے دل میں مرٹک کے اس ویران حصے کا ڈر پیدا ہو گیا تھا۔

میں ہوں!

سویرے وہ تینوں تیار ہو کر کالج کی طرف چل پڑتے اور دو گھنٹے کی پیدل

مسافت طے کرنے کے بعد کالج پہنچتے کیونکہ ان کے پاس بائیکسکل نہ تھے اور تانگے پر جانے کی توفیق نہ تھی۔ راستے میں مولا داد بار بار تمہے بند جھاڑتا جاؤں کی طرح چلکھاڑتا اور عجیب و غریب حرکات کرتا۔

شفع یا تو مست انداز میں کوئی وہن گلنتا تا رہتا یا کی کے میچوں کے متعلق قصے سناتا۔ ایلی چپ چاپ اپنے خیالات میں کھویا چلا جاتا۔ نہ جانے وہ کہاں رہتی ہے۔ نہ جانے اسے معلوم بھی ہے یا نہیں۔ اس کی سمجھیں نہ کہتا تھا کہ کس طرح اس کا پتہ لگانے اسے صرف یہی معلوم تھا کہ اس کے بھائی پہلے کسی ففتر میں ملازم تھے اور اب ان کا ارادہ تھا کہ ملازمت چھوڑ کر وہاں شروع کر دیں اور ان کا نام آغا صاحب تھا۔ آغا غلام بخش۔

وہ امر تسریں آوارہ پھرتے ہوئے غور سے لوگوں کے بورڈ پر صたらہتا کہ شاید کہیں آغا غلام بخش کا بورڈ ہو مگر کئی روز تک وہ بے کار گھومتا رہا اور اسے وہ بورڈ نظر نہ آیا۔

ایلی کے دل میں تسلیم کے متعلق نقوش و حندلے پڑتے جا رہے تھے اور جوں جوں وہ حندلے پڑتے ڈوبتے کے مانند وہ ان تنگوں سے شدت سے چمٹے جاتا جس قدر وہ نقوش و حندلے تھے اسی قدر اس کا جذبہ محبت بڑھتا جا رہا تھا وہ ڈرتا تھا کہ کہیں وہ شکل اس کے دل سے محونہ ہو جائے اور اسے محبوبہ کی ازسر نوجیتو کرنی پڑے کہیں ایک مرتبہ ”سب کچھ“ ہو جانے کے بعد وہ پھر سے ”کچھ بھی نہ“ نہ رہ جائے۔

برقعہ میں لپٹی ہوئی ہر عورت کو وہ امید بھری نگاہ سے یوں دیکھا جیسے اسے توقع ہو کہ وہ چپکے سے اس کے پاس چلی آئے گی اور قریب آ کر برقعہ اٹھا کر رازدارانہ انداز سے جھانکے گی اور پیار بھرے لبھے میں کہے گی۔ تسلیم میں ہوں۔

ہر برقعہ پوش لڑکی جب اس کے قریب سے چپ چاپ گزر جاتی تو اسے دکھسا

محسوس ہوتا لیکن جلد ہی دور سے آتی ہوئی کوئی اور بر قعہ پوش اس کی امید کامرنے بن جاتی اور وہ بڑے شوق سے اسے ٹھوٹتا شاید وہ نورانی دھبہ اور گھنگھریاں لٹ اس بر قعہ میں ملفوظ ہو۔ اکثر مرتبہ ایسا بھی ہوتا کہ کمپنی باغ میں ٹھبلتے ہوئے اسے اڑکیوں کے گروہ دکھائی دیتے جنہوں نے بر قعہ اٹھائے ہوتے اور اسے کئی ایک سفید دھبہ اور گھنگھریاں بھوری لشیں دکھائی دیتیں اور اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کس کی طرف دیکھے۔ اسے سمجھی گوری چٹی لڑکیاں حسین معلوم ہوتی تھیں لیکن ان میں سے کوئی بھی اس کے قریب نہ آتی اور روز دارانہ انداز میں نہ کھلتی۔ ”تسالیم۔ میں ہوں۔“ یہ صورت حال بند تکلیف دھتی اور سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ امر تر میں وہ کسی سے دل کی بات نہ ہے سنا تھا۔

شفع تو صبح و شام سانپ مارنے پر چھلنے کو دنے۔ گلنے اور بالآخر ہاکی کی دلچسپی میں کھویا رہتا تھا اور مولا داد کی شکل و صورت ہی ایسی تھی کہ اس سے کوئی رنگیں بات بیان نہ کی جاسکتی تھی۔ کالج میں میبوں اڑکے تھے مگر وہ ان سے اچھی طرح واقف نہ تھا مثلاً مدھوک تھا۔ اونچا لمبا پیارا ساسا تھی۔ جس کے انداز سے بے پناہ ہمدردی پلکتی تھی اور جس کی آنکھوں پر گھنٹی اور لمبی بھویں عجیب پنما نگ اثر رکھتی تھیں۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود ایلی کے لیے مدھوک سے ایسی بات کرنا ممکن نہ تھا۔ پھر وہ پست قد بشیر تھا مگر وہ تو سرا مر منخر تھا اس سے کوئی سنجیدہ بات نہ ہو سکتی تھی۔ البتہ آصف تھا۔

..... آصف

آصف ایک خوبصورت اور روز قد اڑکا تھا جو بات پر شرم اجانے کا عادی تھا اور جس کے جذبات ہر لمحہ اس کے چہرے پر گلابی رنگ کی صورت میں ناپختہ رہتے تھے۔ معمولی سی بات پر اس کے رخساروں پر ایک گلابی لہر دوڑ جاتی۔ نگاہیں جھک جاتیں آنکھوں میں پھل بھڑیاں سی چلتیں اور جسم بید کی طرح جھوٹا۔

آصف زیادہ باتیں کرنے کا شو قین نہ تھا اور نہ ہی محفل میں جانے کا دلدارہ جب بھی لڑکے خالی پیریڈ میں کالج کے گراؤنڈ میں کھڑے ہو کر خوش گپیاں کرتے وہ مسکراتا ہوا آنکھا اور چپکے سے ایلی کو اشارہ کرتا اور وہ دونوں چپکے سے وہاں سے کھسک جاتے اور یا تو پہلو ان کی رومکان پر بیٹھ کر پوری کچوری کھاتے یا راموپان والے سے سگریٹ خریدتے۔ بازاروں میں گھوٹتے پھرتے ہوئے جب بھی کوئی عورت قریب یا ووڑے سے گزرتی جس کے سینے پر سلوٹ پڑے ہوتے تو آصف ایلی کو کہنی مار کر چپکے سے کہتا۔ ”وہ بیکھو۔ وہ ادھر۔“

آصف کو کپڑے کی سلوٹوں اور متناسب جسم کے دائروں سے بے پناہ وچکی تھی جسے اس نے حامی کوں کے ملائی تھی ظاہر نہ کیا تھا۔ اس کے احساسات بے حد پاکیزہ اور لطیف تھے اور جذبات میں شاعرانہ رنگ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا لیکن عورت کے جمال کے علاوہ اسے اس سے کوئی اور وچکی نہ تھی بلکہ عورت کے قرب کا ڈر اس کے دل میں خطرناک قسم کی شدت اختیار کر چکا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ عورت کے جمال کو دیکھے۔ اس کے جسم کے خم و پیچ کو جانچ چوری چوری حسن سے محفوظ ہو مگر دیکھے جانے والی کو احساس نہ ہو جائے کہ اسے دیکھا جا رہا ہے۔ نگاہیں چارہ ہو جائیں اگر کوئی شوخ راہ کیر نگاہ بھر کر اسے دیکھ لیتی تو آصف کو پیسہ آ جاتا۔ آنکھیں پلکوں تلے غروب ہو جاتیں اور رخساروں پر یوں ہوا یاں چلتیں جیسے غروب آفتاب کے وقت بادلوں میں گلابی نقوش بننے بگزتے ہیں۔

آصف کی طبیعت ایسی تھی کہ ویر تک اس سے دل کا راز نہ کہنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے ایلی نے ایک روز ٹھہلتے ٹھہلتے اس سے اس دھبے اور گھنگھریاں لٹ کا راز کہہ دیا۔ ایلی کا قصہ سن کر آصف نے ہتھیلی پر رخسار رکھ کر ترچھی نگاہ سے اس کی طرف دیکھا اور پھر اس کی آنکھوں میں گلابی بوندیوں کی پھوار پڑنے لگی۔ ”تم تو چھپے رسم ہو۔“ وہ مسکراتے لگا۔

گلابی جھینپ

آصف سے درد دل کہنے کا ایلی کوکوئی فائدہ نہ ہوا۔ نہ کسی لڑکی نے قاب پلٹ کر کہا ”تسالیم میں ہوں۔“ اور نہ ہی کسی بورڈ پر آغا غلام بخش لکھا نظر آتا۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ جب ایلی لڑکوں میں کھڑا ہوتا تو آصف پچکے سے آ کر کہتا ”تسالیم،“ اور ہاتھاٹھا کر سر جھکاتا اور پھر مسکراتنے جاتا جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے کچھ سمجھا رہا ہو جتا رہا ہو۔

ایک روز حسبِ معمول آصف اور ایلی دونوں کا لج اگراؤنڈ کے درمیان کھڑے مہر کی طرف دیکھ رہے تھے جو کان لمح کا حسین ترین ناظمِ لڑکا تھا۔ مہر بھاگتا ہوا آ رہا تھا دفلتا اسے ٹھوکر لگی اور اس کی ٹوپی دور جا پڑی۔ مختصر یا لے بال بکھر گئے۔ اس پر آصف مدھم آواز میں گلمندیا ”وکیپیس یہی تو نہیں تمہاری تسالیم،“ اور ایلی نے ایک نظر مہر کی طرف دیکھا پھر محسوس کرنے لگا جیسے وہ تسالیم کا ہم شکل ہو۔

اس کے بعد تمام تر بکھری توجہ مہر پر مرکوز ہو گئی اس کے ذہن میں تسالیم نے مہر کا روپ دھار لیا۔

علی لمح ایلی بڑے شوق سے کان لج آتا اور پھر آتے ہی اس دروازے پر کھڑا ہو جاتا جہاں سے مہر داخل ہوا کرتا تھا اور وہاں کھڑا مہر کا انتظار کرتا رہتا۔ مہر آ جاتا تو ایلی کے جسم میں بکلی کی ایک کرنٹ سی دوڑ جاتی اور پھر وہ سارا دن یہ سوچتا رہتا کہ کس مقام پر کھڑا ہو۔ اور کس سمت سے دیکھتا کہ مہر کا مسکراانا ہو اچھہ پورے طور پر اسے نظر آتا رہے۔ دوپہر کے وقت جب رسک ہوتی تو آصف اور ایلی کان لج کے دروازے کی طرف بھاگتے جس سے گزر کر مہر گھر جایا کرتا تھا وہ گزر جاتا تو دونوں پہلوان کی دوکان پر پوریاں کھاتے نہیں ختم و پیچ دیکھتے۔ مہر کی واپسی کا انتظار کرتے۔ اگرچہ مہر کی حیثیت محض نعم البدل کی تھی لیکن اس سفید و ہبے اور بھوری لٹ کی نسبت جسے ڈھونڈنا لئے میں وہ ناکام ہو چکے تھے۔ یہ نعم البدل ایک ثابت اور

ٹھوں حقیقت تھی۔ اور حقیقت بھی ایسی جس پر ایک خواب کا سا عالم طاری رہتا تھا۔
چونکہ مہر نہ تو گردن اٹھانے کا عادی تھا۔ نہ قریب آ کر بات کرنے کا۔ اس کے
عکس وہ ایک دور کا موہوم قسم اور گلابی جھینپ کی آمیزش تھا۔ لہذا چاہے وہ لڑکا تھا یا
لوگ کی ایلی کے لیے چند افراد فرقہ نہیں پوتا تھا۔

کالج کے بعد ایلی اور آصف امرتر کے بازاروں اور باغات میں گھومتے رہتے
یا آصف کے کھربجا بیٹھتے۔ آصف گھومنے کا بہت شوق تھا مگر اسے اپنے والدین کی
عزت اور اپنی نیک نامی کا بہت خیال رہتا تھا۔ بازاروں میں چلتے ہوئے وہ ہمیشہ سر
جھکا کر چلتا تاکہ اس کے روپیے سے آوارہ پن ظاہر نہ ہونے ہی وہ ایسے علاقوں میں
جانے کے لیے تیار ہوتا جہاں پائے جائے پر بدناہی کا خدشہ ہو مثلاً وہ کثرہ رنگیں
میں کسی بھی داخل نہ ہوتا حالانکہ یہ کثرہ ان کے مقام کے قریب ہی تھا۔

کثرہ رنگیں

کثرہ رنگیں میں رقصاصاً میں رہتی تھیں اور وہاں سے ہر وقت دلکش آوازیں آیا
کرتیں۔ کبھی دور سے سارگی بیان کرتی ہوئی سنائی دیتی کبھی ستار قص کرتی اور کبھی
طلبدہ کی تھاپ سن کر ایلی کے دل میں کچھ کچھ ہونے لگتا۔ اس وقت ایلی کا دل چاہتا
کہ ایک بار کثرہ رنگیں میں سے گزرے اور ان آوازوں کو قریب سے سنے۔ آصف
بھی ان آوازوں کو سن کر مسکراتا اور اس کی آنکھوں میں گلابی یوندیوں کی پھوار پڑتی
لیکن وہ ایک لمبی آہ بھر کر کسی اور طرف مڑ جاتا۔ ایلی آصف کی وجہ سے مجور تھا اس
لیے وہ بھی کبھی اس کھڑے میں داخل نہ ہوا تھا۔ وہاں اکیلے جانا بھی تو مشکل تھا اس
نے کئی بار ادھر کا رخ کیا تھا مگر موڑ پر جا کروہ گھبرا جاتا اور اس کا دل دھڑ کنے لگتا۔

کئی ایک مرتبہ شیخ ہدم کے ساتھ بھی اسے امرتر کے بازاروں میں گھومنے کا
اتفاق ہوا۔ ہدم تجارت کے سلطے میں امرتر آتے رہتے تھے اور ہمیشہ آنے سے
پہلے خط کے ذریعہ ایلی کو اطلاع دے دیتے ”ایسا صاحب میں آ رہا ہوں شام کو

تمن بجھے مجھے کمپنی باغ کے مرکزی پلاٹ میں ملئے۔ وہاں سے ہم سینما جائیں گے۔
ہدم ایلی سے ملتے ہی مخصوص انداز میں چلانا شروع کر دیتے۔ ”ایلی صاحب یہ
کیا مصیبت ہے آپ ایسے دکھائی دے رہے ہیں جیسے قیامت لوٹی ہو، عشق تو نہیں
ہو گیا کہیں۔ عشق سے بچنے کا بہترین طریقہ ہم بتائیں گے۔ آئیے آئیے نا
صاحب۔“ اور وہ اسے دودھ کی دوکان پر لے جاتے۔ ہاں پہلو ان ذرا آدھ سیر
دودھ میں چار بیٹھے ہوئے ہوتے۔ بس الیاس صاحب صبح و شام کھاؤ پوشاک اللہ عشق قریب
نہیں پہنچے گا۔ اس مرض کے لیے دودھ ہی تریاق ہے اور بھریٹ اور چائے سے
پہنچ لازم ہے۔ آئیے اب سینما چلیں۔ سینما دیکھنا صحت کے لیے بے حد مفید ہوتا
ہے۔ آئیے رام باغ میں مشرب زاف نورا کی فلم لگی ہے۔ اور وہ دونوں سینما چلے
جاتے وہاں سگریٹ پینتے پوریاں کھاتے اور بھریٹ ہدم رات کی گاڑی سے واپس علی
پور چلے جاتے اور ایلی آموں والی کوٹھی کارخ کر لیتا۔ ایلی کے دل میں ایک دلی دلی
امید تھی کہ شاید کسی روز شیخ ہدم یا سینمہ سینما ہاؤس جانے کا ارادہ کر لیں جو کشوہ رنگیں
میں واقع تھیں لیکن ہدم نے کبھی اس میں جانے کی بات نہ کی تھی۔

پھر ایک روز امرتر میں دو مشہور شاعر تشریف لائے۔ جن سے آصف کے
گھرے تعلقات تھے ان کی آمد پر آصف کو امرتر میں ایک عظیم مشاعرے کا انتظام
کرنا پڑا اور حسناتفاق سے وہ مشاعرہ یا سینمہ سینما ہال میں ہونا قرار پایا۔ جو اس
منوع کشوہ میں واقع تھا آصف نے پہلے تو بہت کوشش کی کہ مشاعرے کا انتظام کسی
اور جگہ ہو جائے لیکن وہ کامیاب نہ ہوا بہر حال آخر کار اسے کھوئے میں جانا ہی
پڑا۔

کشوہ رنگیں امرتر کے خوب صورت ترین بازاروں میں سے تھا اس کی لمباںی
ایک فرلانگ سے زیادہ نہ تھی ویسے کافی فراخ تھا۔ سڑک کے دو رویہ خوبصورت
چوبارے بننے تھے جن کے چھوٹے ہوئے تھے جن پر رنگ روغن کیا ہوا تھا

ان پچھوں کے پیچھے فراغ چوباروں میں چاند نیاں بچھی ہوئی تھیں۔ گاؤں تکیے لگے ہوئے تھے اور چھتوں سے جھاڑ فانوس لٹکتے دکھائی دیتے تھے۔ جنگلوں میں خوب صورت رقصائیں دیدہ زیب ملبوسات پہننے بڑے طمطاق سے بیٹھی نگاہ غلط انداز سے نیچے بازار کی طرف دیکھتی رہتیں۔ ان کی حرکات جمیل تھیں آوازیں لوچ دار تھیں۔

ایلی انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ بھی تصور نہ کر سکتا تھا کہ تاپنے گانے والی عورتیں اس قدر طیف اندازا اختیار کر سکتی ہیں خصم صاؤہ چوبارے جو اس کے متصل ماحق تھے ان کی بین تو نبی حصہ جاذب نظر تھیں۔ بازار میں دو رو یہ خوبصورت دو کامیں تھیں جن میں پنواڑیوں کی شرکت تھی۔ پنواڑیوں کی دو کانوں پر آتے جاتے پان کھانے کے بہانے کھڑے ہو جاتے اور پھر عاشقانہ نظروں سے چوباروں کی طرف دیکھتے۔ ان کے متعلق فقرے چست کرتے یا عریاں اشارے کرتے جس پر چوباروں میں بیٹھی ہوئی رقصائیں اطیف تبسم سے من پھیر لیتیں۔

شام کے وقت اس کوچے میں گویا بہار آ جاتی تھی۔ چوبارے والیاں شام سے پہلے ہی نہاد ہو کر نیا جوڑِ ابدیتیں سنگار کرنے کے بعد وہ تیار ہو کر جنگل میں آ بیٹھتیں۔ رات پڑتے ہی محفل ہائے نشاط آ راستہ ہو جاتیں۔ کہہڑہ موسیقی کی آوازوں سے گونجتا سارنگیاں چھڑ جاتیں گھنگھرو بجھتے لے بلمپت سے شروع ہو کر درت ہوتی جاتی اور جوں جوں رات بھیکتی گیت کے بولوں کی اوائیں میں عریانی کا غصر بڑھتا جاتا۔

نیچے بازار میں محروم مگر شو قیں مزدوروں کی پکیوں سے مرٹک اور دیواریں رنگی جاتیں اور ان کے نعرے بلند ہوتے جاتے۔

”نمیری جان۔“

”ایک نظر ادھر بھی۔“

”ڈھول لکھنادل پر دیساں دارا جی رکھنا۔“

بالآخر ان کی محرومی افطراب میں بدل جاتی اور کسی معمولی سے بہانے پر یہ افطراب شدت اختیار کر لیتا اور پھر آپس میں گالی گلوچ تک نوبت پہنچ جاتی اور کھڑہ میں لڑائی شروع ہو جاتی کسی کا سر پھٹ جاتا اسی کا پیٹ چاک کرو دیا جاتا پھر پولیس میدان میں آ پہنچتی۔ اب جگر تھام کے بیٹھو میری باری آئی۔ کسی نگاہیں ڈالتے ہوئے چوباروں میں بیٹھے ہوئے سینٹھ اس ہنگامے پسے کھبرا کر میرا شیوں کو برخواست کر دیتے اور رقصہ کا قرب حاصل گر کے خود کو ایک شدید تر ہنگامے کے حوالے کر دیتے تاکہ کھڑے گئے ہنگامے سے بچات حاصل کر سکیں۔

مجسم شعر

ایلی یا سینما کی فراخ ڈیوڑھی میں کھڑا ہیرانی سے کھڑے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سینما کے مقابل کے چوبارے میں بیٹھی ہوئی رقصہ کس قدر حسین و جمیل تھی۔ اس کی حرکات کس قدر متوازن اور لافریب تھیں۔ اس کا وہ بے پرواں اور بے نیازی بھر انداز سے اور بھی خوب صورت بنا رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا مجیسے رقصہ نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کی حرکت سے بھی تو ستاپن۔ عریانی یا نمائش کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔

آصف سینما ہال کے اندر چھپا ہوا تھا تاکہ کوئی اسے وہاں دیکھنے پائے۔ ایلی ڈیوڑھی میں کھڑا چوری چوری چوباروں کی طرف دیکھ رہا تھا اس کے دامیں باعثیں کھڑے سمجھی لوگ بے تکلفی سے طوائفوں کی طرف دیکھ رہے تھے پھر بھی نہ جانے کیوں ادھر دیکھنے میں اس حد تک مصروف تھے کہ انہیں ایلی کی طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہ تھی اور اگر فرصت ہوتی بھی تو وہ اس کے اس فعل کو قطعی طور پر اہمیت نہ دیتے۔

دفعتاً ایک اور گروہ ڈیوڑھی میں داخل ہوا جس کے پیش پیش ایک نوجوان تھا

جس کے بال بکھرے ہوئے تھے آنکھوں میں مستی جھلک رہی تھی اور چہرے سے شفاقتگی اور ذہانت پیش تھی۔

”اخاہ.....“ وہ سامنے کے چوبارے میں بیٹھی ہوئی حسینہ کی طرف دیکھ کر بے تکلفی سے چلا�ا۔ ” سبحان اللہ عظیم شعر ہیں۔ واہ وا۔ واہ وا۔“ وہ جھلک لی باندھ کر دیوانہ اور رقصہ کی طرف دیکھنے لگا اس کے ساتھی منکرانے لگے۔

”واہ وا کیا اندزا زلبیری ہے حسن بذات خود انگشت بے دندال ہے۔“ رقصہ نے شور سن کر ایک بکھر پور نکاح اس نوجوان پر فرازی۔

نوجوان عالم مستی میں تینما کے دروازے کی بیڑیوں پر بیٹھ کر رقصہ کی طرف دیکھ دیکھ کر چلانے لگا۔ ” اللہ کی نعمت ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است۔“ آصف بھاگتا ہوا ہال سے باہر لگا اس کا رنگ نرود ہو رہا تھا اور وہ کانپ رہا تھا۔ وہ شاعر سے مخاطب ہو کر چلا�ا۔ ” یہ کیا کر رہے ہیں آپ لوگ کیا کہیں گے۔“

آغا

”بھی واہ۔“ بے خود حیرانی سے چلا�ا۔ ” اس میں کہنے کی بات کیا ہے۔ کیوں بھی تم کچھ کہتے ہو کیا۔“ اس نے جملہ لوگوں کو مخاطب کر کے پوچھا۔ اور طوالیف کی طرف جھلک لی باندھ کر با آواز بلند یہ شعر پڑھنے لگا۔

نظر کو کو ہے عادت تماشا!
جہاں ہو جیسا ہو جس طرح ہو
کوئی یہ حن ازل سے کہہ دے
کہ جلوہ آرا ہو جس طرح ہو
شعر سن کر لوگ جھومنے لگے اور آصف گھبرا کر ایلی کی طرف بڑھا۔
” ہائیں۔ آصف ایلی کے پاس کھڑے ایک شخص کو دیکھ کر بولا آپ ہیں آغا
صاحب آپ یہاں۔

آغا صاحب۔ ایلی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا وہ درمیا نے قد کا شخص تھا
چہرے پر متنات کے آثار تھے اور انداز سے خلوص نہیں تھا۔

”یہ ہیں الیاس میرے ہم جماعت اور دوست۔“ آصف نے آغا سے کہا۔

”بڑی خوشی ہوئی آپ نے مل کر۔“ آغا صاحب نے ایلی سے مصافحہ کرتے
ہوئے کہا ”آپ امیر گرے رہنے والے ہیں۔“

”جی میں۔“ ایلی نے جواب دیا۔ ”میں تو علی پور کا ہوں۔“ ”علی پور، آغا
صاحب نے وہ بڑا۔“ وہاں میرے ایک عزمیز دوست علی احمد رہتے ہیں۔ بڑے
رنگیں مزاج ہیں۔“ وہ بنتے لگا۔
”یہ انہیں کے بیٹے ہیں۔“ آصف نہ کہا۔

”علی احمد کے بیٹے۔“ آغا صاحب نے پھر ایلی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔
”کتنی خوشی ہوئی آپ سے مل کر خاکسار کو آغا غلام بخش کہتے ہیں۔ آپ کے والد
صاحب میرے گھرے گھرے دوست ہیں اور مہربان بھی۔“

آغا غلام بخش۔ ایلی کی نگاہ میں گرد و پیش و ہند لائے۔ نہ جانے وہ جوان شاعر
سیڑھیوں پر بیٹھا کیا کہہ رہا تھا۔ نہ جانے چوبارے میں بیٹھی ہوئی گلابی کریپ میں
لبوس رقصہ کیے مسکرا رہی تھی۔ ایلی کی نگاہوں تلے اس شور بھرے ہند لکے میں آغا
صاحب کے علاوہ سبھی معدوم ہو چکے تھے اور آغا صاحب کے عقب میں ایک
گھنگھریاں لٹک رہی تھی اور ایک رنگیں دھبہ مسکرا رہا تھا۔

”تسلیم،“ آصف نے مسکرا کر ایلی کی طرف با معنی انداز سے کہا۔ ”تسلیم،“ آغا
صاحب کے عقب میں کسی تبسم چہرے نے گھنگھریاں لٹک جھک کر کہا۔

ایلی کے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ وہ خوشی سے ناچنے لگے اور چیخ چیخ کر کہے
”تسلیم مزاج اچھے ہیں۔“

”تسلیم آپ آغا صاحب ہیں۔“ ”تسلیم مجھے آپ سے مل کر بے حد خوشی

ہوئی۔ ””وَتَسْلِيمٌ.....“

آغا صاحب کا مکان یا سینما کے قریب ہی کھڑہ رنگیں میں واقع تھا مکان کے باہر ایک سارکی دوکان تھی جس کے پیچھے ایک والان تھا جس میں گھلتا تھا جسے ملاقاتی کمرے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اور جس کے ایک پہلو میں ایک زینہ اوپر کو چلا گیا تھا۔ آغا کے گھر کے لوگ اوپر چوبارے میں رہتے تھے اور یہ چوبارہ کھڑے کے باقی چوباروں کی طرح تھا۔ فرق صرف اس قدر تھا کہ اس کے آگے بالکل نہ تھی اور چوبارے کی تین کھڑکیوں پر چھین پڑی ہوئی تھیں اور ان کھڑکیوں سے کبھی کسی نے باہر نہ جھانا لاتھا۔

ایلی اس بات پر تمیلان نہ ہوا کہ وہ اس چوبارے میں کیوں رہتے تھے اور اگر رہتے تھے تو کھڑے کی رسم کے مطابق وہ کھڑکیاں چھوٹوں سے خالی کیوں نہ تھیں یہ باتیں غیر اہم تھیں۔ اس لیے تفصیلات اس کی توجہ کو جذب نہ کر سکیں اور وہ اپنی امیدوں کے اس گھوارے کو دیکھنے میں کھو گیا۔

تیتم نیم

آغا کے ساتھ ملاقاتی کمرے میں بیٹھے ہوئے اس کے احساسات عجیب سے تھے وہ اس بات پر مسرت محسوس کر رہا تھا کہ وہ اسی مکان میں بیٹھا ہے جہاں وہ راتی ہے اسی چھت تلے بیٹھا ہے جس کے اوپر نہ جانے وہ کس کام میں مصروف ہے آغا سے باتیں کرنے کے باوجود اس کے کان ان آوازوں پر لگے ہوئے تھے جو اوپر سے آ رہی تھیں۔ ”ہائے میں کیا کروں۔ لو میں کیا جانوں یوں ہوتا ہے۔“ ان آوازوں میں لے تھا راگ تھا۔ شوختی تھی۔ ان قدموں کی آوازوں میں ترجم تھا۔ اوپر سے بہت سی آوازیں آ رہی تھیں لیکن ان سب کا ایک ہی انداز تھا جیسے سانچے میں ڈھلی ہوں۔ نہ جانے اس کی آواز کون سی تھی۔

جب والان کے اوپر چنگے سے کوئی پولہ راتا ہوا نکل جاتا تو ایلی کا دل دھک سے

رہ جاتا۔ ان پلوؤں کی اڑان کتنی حسین تھی۔ بظاہروہ آغا سے باقیں کر رہا تھا مگر اس کا دل کسی اور ہی لے پر ناج رہا تھا اور آغا میں بھی کتنی مٹھاس تھی اس کے چہرے پر اطمینان کی ایک دبیز تہہ چڑھی ہوئی تھی۔ سکون اور اطمینان۔ گویا وہ یوں اپنے آپ میں مگن تھا جیسے کوئی ناؤ کسی ساکنِ جھیل میں چپوؤں کی مدد کے بغیر آپ ہی آپ روایت ہو۔

”اچھا بھی میں ذرا نہ لاو۔“ آغا صاحب اٹھ بیٹھے ”ابھی پانچ منٹ میں حاضر ہوا۔“ وہ قریب ہی غسل خانے میں داخل ہو گئے۔

ایلی موقعِ غیمتِ جان کر بالا لگف اور پوچھنے لگا جہاں سفید سفید آنچل اپنارہ ہے تھے۔ ”بھائی جان۔“ ایک سریلی آواز سنائی وہی معصوم کلبی چہرہ جھکا۔ ایک تمسم جھلکا۔ ”بھائی جان۔“ پھر آواز آئی۔

چند ساعت کے بعد نوؤں سال کی ایک حسین چینی کی گڑیا نیچے اتر آئی۔ اس نے ایلی کی طرف دیکھا اور پھر ایک منبسم مسکراہٹ سے شرما کر منہ موڑ لیا وہ صابوں اور تویہ غسل خانے کے دروازے پر رکھ کر بھاگ گئی اور پھر دروازے کی درز سے مسکرا کر جھانکنے لگی۔

”رکھ دیا نیم۔“ آغا نے پوچھا۔

”جی دروازے میں ہے۔“ وہ بولی اور پھر بامعنی اندازے مسکرا کر بھاگ گئی۔ آہستہ آہستہ ایلی اور نیم دوست بن گئے۔ جب ایلی زینے میں کھڑے ہو کر آواز دیتا ”آغا صاحب“ تو بالائی منزل کے دروازے میں رنگین سرگوشیاں ہوتیں۔ پھر نیم مسکراتی ہوئی نیچے اتر آتی۔

”وہ کہاں ہے نیم۔“ ایلی اس سے دبی آواز میں پوچھتا۔

”ہے، وہ کہتی“ وہاں دروازے کی اوٹ میں۔“ وہ زیادہ تر اشاروں میں جواب دیتی تھی۔ اس کے اشارات میں عجیب شان بے نیازی تھی۔

”اس سے کہو سامنے آئے۔“ ایلی کہتا۔

”ہونہہ۔ وہ نہیں آتی ہم کیا کریں۔“

”تم نے کہا بھی تھا۔“

”کہہ رہی ہوں کہا تھا کہا تھا اور کیا کرتی۔“

”پھر کیا کہتی ہے وہ۔“

”بس نہیں جاتی ہے۔ چھوڑوا سے۔“ وہ ہونٹ نکال کر جواب دیتی۔ ”مجھے سائیکل کی سیر کرونا۔ کروں گے۔“ وہ زبردست اپنی بات چھیڑ دیتی۔

”لے چلوں گا۔ لے چلوں گا۔ پہلے یہ بتاؤں کیا وہ باہر نہیں نکلتی۔ کہیں جاتی نہیں۔ سیر کرنے کیا رہیے۔“ وہ تھیڑ سے ہونٹ نکالتی۔ ”چھوڑوا سے۔“

ہوتا ہے، ہوتا ہے

”پہلے جا کر اس سے کہو کہ دروازے سے جھانکے۔ بڑی پیار ہے نیم۔ جاؤنا۔“ نیم بڑی مشکل سے اوپر جانے کے لیے تیار ہوئی۔ پھر آہستہ آہستہ بیٹھیاں چڑھتی پھر اوپر دے دروازے میں نگین سرگوشیاں ہوتیں۔ ہلکے ہلکے تھقہے سنائی دیتے اور بالآخر دروازے سے ایک سفید بازوں کل کلہ اتنا اور انگلیاں یوں ناچھیں جیسے کھاکلی کے کسی مندر اکی مشق کر رہی ہوں۔ پھر گھنگھر یا میلٹ اڑتی۔

لواس سے کیا ہوتا ہے۔ کوئی نہ کہتی۔

بالآخر نیم نیچے اتر آتی۔ ”وہ نہیں آتی سامنے کہتی ہے ہم کسی کے سامنے نہیں آیا کرتے۔“ وہ منہ بنا کر کہتی۔

ایلی روز جان بوجھ کرایے وقت آغا کے یہاں جایا کرتا تھا جب وہ گھر پر نہ ہوں اور پھر ڈرتے ڈرتے دیر تک بیٹھیوں میں کھڑا رہتا۔ پھر وہ شام کے وقت دوبارہ وہاں جاتا اور آغا صاحب کے پاس بیٹھا رہتا اور اوپر سے عجیب و غریب با معنی

آوازیں سنائی دیتیں۔ پلوہراتے اور کبھی کبھی موقعہ پا کر لوہے کی سلاخوں سے سفید بازو جھولتے اور کوئی کہتی ”لواس سے کیا ہوتا ہے۔“ اور کوئی جواب دیتی۔ ”ہوتا ہے ہوتا ہے۔“ اور ایلی محسوس کرتا جیسے اس آواز میں طنز ہو پھر وہ سوچنے لگتا کہ آخر کس بات سے کچھ ہوتا ہے اور وہ دیر تک سوچتا رہتا۔ حتیٰ کہ آغا صاحب نہا کر باہر نکل آتے اور کپڑے پہننے لگتے اور پھر وہ دونوں باہر گھومنے کے لیے چلتے جاتے۔

شام کے وقت حتیٰ آ جاتا۔ حتیٰ آغا کا چھوٹا بھائی تھا مگر اس کی طبیعت آغا صاحب سے قطعی طور پر مختلف تھی۔ جسمانی طور پر بھی ان دونوں میں کوئی مشابہت نہ تھی۔ حتیٰ کا جسم پتلاؤ بلا تھا اس کے چہرے پر شوخی اور فطر اب چھائے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ حتیٰ کے خدوخال بے حد جاذب نظر تھے۔ ایلی نے جب پہلی مرتبہ اسے دیکھا تو وہ چونک پڑا۔ اس وقت وہ رام چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ سبز چادر میں خوب صورت خدوخال دیکھ کر ایلی نے سمجھا جیسے کوئی خاتون غلطی سے مردانے میں آ گئی ہو۔

حتیٰ بہت جلد ایلی سے مانوس ہو گیا۔ اس کی باتیں عجیب تھیں۔ ”ایلی،“ وہ چلاتا آؤ ایلی تمہیں عیش کر لائیں۔ آؤ تمہیں تمہاری ہم نام کے پاس لے چلوں۔ اتنی رسیلی آنکھ ہے کہ اگر اس کی ایک نگاہ پڑ گئی تم پر تو طبیعت صاف ہو جائے گی اور کیا جسم ہے۔ شعلے نکلتے شعلے۔ چلو ملا لاوں تمہیں۔ اپنے پرتو مرتبی ہے لیکن بڑی اچھی ہے چلو۔“

ایلی حیرانی سے اس کی باتیں سنتا اور پھر گہرا کر کہتا۔ ”پھر سبھی کبھی۔“ اور حتیٰ منہ بنا کر کہتا۔ ”چھا بھی تو پھر میں تو چلا۔“ اور تنہائی میں بینہ کر ایلی اوپرگ کی طرف دیکھتا اور نیم کو اشارے کرتا اور نیم تسلیم کا بازو پکڑ کر اسے سیڑھیوں کی طرف کھینچتی اور تسلیم نہے جاتی جاتی حتیٰ کہ بوزھی دادی شور مچانا شروع کر دیتی۔ ”لڑکیوں یہ کیا نظر غپاڑہ ہے۔ آرام سے بیٹھو۔“ اور لڑکیاں خاموش ہو جاتیں اور ایلی چپ چاپ محروم اور

مایوس انداز سے باہر نکل کر بورڈنگ کی طرف چل پڑتا۔

گھما گھمی

بورڈنگ کی اس ویران کوٹھی میں بیٹھے ہوئے وہ سوچتا۔ کیا یہ محبت ہے کیا بھی وہ محبت ہے جس کے متعلق شریف اسے خبردار کیا کرتا تھا۔ لیکن دل ہی دل میں اسے احساس تھنگی ہوتا بات کسی لحاظ سے بھی تو مکمل نہ تھی۔ ناق تسلیم نے کبھی تھنگی میں سلا ہوا مینڈک اس پر پھینکا تھا اور نہ کسی اور طریقے سے ایلی کی محبت کی سنجیدگی کو محسوس کیا تھا۔ بلکہ تسلیم کے رویے کو دیکھ کر ایلی سوچتا تھا کہ وہ تو بچوں کا کھیل کھیل کر ہے تھے محبت نہیں کر رہے تھے۔ کیا محبت بچوں کا کھیل ہوتی ہے۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اتنی عظیم چیز بچوں کا کھیل کیسے ہو سکتی ہے۔

اسے یوں خاموش بیٹھے دیکھ کر مولا داد چلاتا۔ ”یہ کیا صورت بنارکھی ہے ایلی۔“
کیا ہماری زندگی بھی حرام کرو گے چلو باغ سے امر و دچڑا کر کھائیں۔ کیوں شفیع۔“
شفیع نہ کر جواب دیتا۔ ”دیکھو تو اپنی صورت۔ دیکھنے میں تو ڈاکونظر آتے ہو اور کرتے ہو چوریاں اور وہ بھی امر و دوں کی۔“
پھر وہ دونوں ایلی کی طرف متوجہ ہو جاتے۔

”اے کیا ہے۔“

”کیا ہے بے تجھے۔“

”عشق کا روگ لگا ہے کیا۔“

”وہ مہر لڑ کا ہے نا کالج میں اس پر مرتا ہے تو۔“

”لواس میں کیا ہے۔“ مولا داد پیار سے کہتا۔ ”کہو تو اٹھالا وہ اسے بیہاں اس کر رے میں۔“

”پا گل ہوئے ہو۔“ ایلی چلاتا۔

ایلی نے تسلیم کے متعلق مولا داد اور شفیع سے کبھی بات نہ کی تھی یہ راز صرف

آصف تک محدود تھا۔ جب بھی وہ آصف سے ملتا اس کا جی چاہتا کہ وہ سنجیدگی سے اس سے پوچھئے کیوں آصف محبت کیا ہوتی ہے۔ کسی طرح کی جاتی ہے۔ اس نے کئی ایک بار آصف سے یہ سوال پوچھا تھا مگر مسکرانے کے سوا آصف نے بھی جواب نہ دیا تھا۔

ہنگامہ

پھر خبر آئی کہ شریف چھٹی پر علی پور آیا ہوا ہے اور ایلی کی آنکھوں میں خوشی کے دیے ٹھیمانے لگے۔ ”میں جاؤں گا۔“ اس نے آصف سے کہا۔

”تم نہیں جانتے۔ آصف مسکرا لیا۔“ تم اسے چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہو۔“

لیکن آصف کے اعتراض کے باوجود وہ گرمی کی چھٹیوں سے دس روز پہلے علی پور آ گیا۔ اب کی بار علی پور ویریان نے تھا وہاں شریف تھا۔ شہزادی رفیق اور رحمند تھے۔ سبھی موجود تھے۔ علی پور پہنچ کر خوشی سے اس کی با چھیس کھل گئیں۔ محلے میں پہنچنے سے پہلے ہی اسے رضال گیا جو ایلی کو دیکھ کر چلانے لگا۔

”کیوں بھی فرہاد وہ نہ کھونے کا کام ختم ہو گیا۔“

”کیا بتتا ہے تو۔“ ایلی نے اسے گھورا۔

”سارے محلے والے کہہ رہے ہیں۔“

”کیا کہہ رہے ہیں۔“ ایلی نے گھبرا کر پوچھا۔

”کہتے ہیں کہ امرتر میں عشق کا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ کانج تو محض بہانہ ہے۔ اس قدر قریب رہتے ہوئے بھی اب علی پور آنے کی فرصت نہیں ملتی۔“

رضائے مل کر جب وہ محلے میں پہنچا تو اس نے محسوس کیا جیسے سبھی لوگ اس کی طرف دیکھ دیکھ کر تمثیر سے نہ رہے ہوں۔

”ہائیں،“ پچھا امداد چلائے۔ ”کیوں بھی ایلی آگیا تجھے بھی ہوش پڑ گیا اسی چاؤ کے چکر میں آخر بیٹا کس کا ہے شاباش۔“ غصے سے ایلی کے کان سرخ ہو گئے۔

”اے ہے یتو ایلی ہے اپنا۔“ محلے کی عورتوں نے اسے دیکھ کر شور مچایا۔

”اللہ عمر دراز کرے۔ جیتا رہے۔ ماں کا کلیجہ ٹھنڈا رہے۔“

”ہائے ایلی تو اب عید کا چاند ہو گیا۔ جوان ہو گیا ہے نا۔“ دوسری مسکرا کر بولی۔

”ہمارے لیے تو وہی ایلی نہیں، ایک مسکراتی۔“

”کیوں ایلی کیا امتر سر میں جی لگ گیا تیرا۔ اب تو علی پور کی طرف رخ ہی نہیں کرتا۔“

”پڑھائی سے فرضت بھی ہو۔“ ایک نے طغرا کہا۔

”تو آیا ہے ایلی۔“ باجرہ شور سن کر بھاگنی بھلاکی آئی۔ ”آ میں تو کب سے تیرا انتظار کر رہی تھی۔“ ایک نے سکرا کر کہا۔ ”اللہ رکھے اب جوان ہو گیا ہے۔“

”داوی اماں اسے دیکھ کر کھڑکی سے چلانیں۔“ ”کب آیا تو۔“

”جا داوی اماں سے مل لے۔ اس کا جی اچھا نہیں۔“ باجرہ نے کہا۔

”داوی اماں کو دیکھ کر وہ بھاگا اور بھاگ کر اس سے بغل گیر ہو گیا۔

”کیا کرتا ہے تو۔“ وہ چلاتی۔ ”وہی جاث کا جاث ہی رہا تو۔“ اور وہ کھانے لگنی۔

”کیوں داوی اماں۔ بیمار ہو کیا؟“

”نہیں تو۔“ وہ بولی۔ ”اچھی بھلی ہوں۔“

”وہ کا دورہ پڑتا ہے۔“ سیدہ نے کہا۔

”کیوں داوی اماں۔“ اس نے داوی سے پوچھا۔

”اب بھی نہ پڑے گا دوہے کا دورہ تو کب پڑے گا۔“ وہ نہیں۔

عین اس وقت تیزی سے کسی کے بیٹھیوں سے اترنے کی آواز آئی اور چھم سے

شہزاد اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ ”ناہے ایلی آیا ہے۔“

ایک ساعت کے لیے ایلی شہزاد کو دیکھ کر بھونچ کارہ گیا جالی کے سیاہ دوپٹے پر سفید پھول چمک رہے تھے اور وہ اس کے شانوں پر یوں اڑ رہا تھا۔ جیسے پر پھٹر پھٹڑا رہے ہوں۔ اس کے ہوتلوں پر عجیب ساتھ م تم تھا۔ ایسا قسم جو اس سے پہلے ایلی نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ نگاہوں میں غیر معمولی چمک تھی اور گاہوں پر سرخی جھلک رہی تھی جیسے لجارتی ہو۔ وہ تو بھی لجائی نہ تھی اس کے انداز میں تو ہمیشہ بے نیازی کی جھلک ہوتی تھی۔ ایلی نے محشوں کیا جیسے دعاؤں شہزاد نے کیٹلی بدل لی ہو۔
”ایلی آؤ نا۔ وہ بولی۔“ تمہیں بلار ہے یہیں وہ جلدی آؤ۔ وہ مسکراتی۔
ایلی کے جسم پر چیزوں کیا جائے لگیں۔

”اے ہے۔“ دادی آماں بولی۔ ”تو سن ہو لکر کیوں رہ گیا۔ دیکھو یوں کھڑا ہے جیسے ہوش میں نہ ہو۔ جانا ہے اوہ تو جا ہوآ۔ میری طرف کیا دیکھا ہے۔“
”تمہیں مبارک ہوا یلی۔“ شریف اس کی طرف دیکھ کر مسکرا یا۔ ”تم پہلے امتحان میں پاس ہو گئے۔“

”کونسا امتحان۔“ ایلی نے پوچھا۔

شریف نے ایک بھر پور نگاہ ایلی پر ڈالی۔ ”پہلے امتحان میں تم پاس ہو گئے اور انشاء اللہ وسرے امتحان میں بھی پاس ہو جاؤ گے۔“

”میں تو ایف اے میں فیل ہو گیا ہوں۔“ ایلی نے گھبرا کر کہا۔ شریف قہقہہ مار کر نہس پڑا اور پاس کھڑی شہزاد کی طرف دیکھنے لگا۔ سیاہ دوپٹے کے سفید پھولوں کے درمیان ایک گلاب کھلا ہوا تھا۔ ”منتی ہو۔“ وہ بولا۔ ”ایلی کی باتیں سن رہی ہو۔“ ”سن رہی ہوں۔“ وہ بولی۔ ”اب تو میں بھی ایلی کی باتیں بڑے غور سے سننے لگی ہوں۔“

”وہ کیسے۔“ شریف مسکرا یا۔

”اب اس کی نگاہ ہیں تو دیکھو ذرا۔“ وہ بولی۔

”اس کی نگاہ“ شریف تالی بجا کر اٹھ بیٹھا۔ ”اس کی نگاہ سے تم کیسے دیکھ سکتی ہو۔ ہر کسی کی نگاہ الگ ہوتی ہے۔ ہر کوئی اپنی نگاہ سے دیکھتا ہے اور۔ اور۔“ اس نے ایک لمبی آہ بھری۔ ”وہ سرے دیکھتے ہیں مگر دیکھنے نہیں۔“ ”مجھے کیا معلوم ہے، شہزاد منہ بنا کر خاموش ہو گئی۔“

ایلی سوچنے لگا رہ جانے کیا باتیں کر رہے تھے وہ دونوں فلٹاں اس نے محسوس کیا جیسے وہ شہزاد کو اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہو۔ ایسی نگاہ سے جس سے شاید شریف نے اسے سمجھی نہ دیکھا ہو۔ لیکن شہزاد اونچ جانے اسے کسی کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔ وہ گھبرا گیا۔

”لیکن آپ تو امتحان کی بات کر رہے تھے۔“ اس نے شریف سے کہا۔

”دنیاوی امتحانات کی بات نہیں۔“ شریف شہزاد کی طرف دیکھ کر مسکرا یا۔ ”میں تو اس امتحان کی بات کر رہا ہوں۔“ ”اچھا تو پھر کون ہے وہ۔ کیسی ہے۔ سناء ہے بڑی خوب صورت ہے۔“ شہزاد نے ایلی کو عجیب نگاہوں سے دیکھا۔ ”خوب صورت۔“ ”خوب صورت۔“ شریف نہ سا۔ ”خوب صورت تو وہ ہے ایلی جسے کوئی دیکھنے والا مل جائے۔“ ”خوب صورتی۔“

”پاگل نہ بنو۔“ وہ آہ بھر کر بولا۔ ”زمخوں کو ظفر سے نہیں کریدا کرتے۔“ ایک ساعت کے لیے شہزاد کی آنکھیں گویا کسی نامعلوم جھیل پر تیر نے لگیں پھر فلٹا وہ مڑی اور کمرے سے باہر نکل گئی اور وہ دونوں تنہارہ گئے۔

”اب تو تم بڑے آدمی بن گئے ہو۔“ شریف نے کہا۔ ”اب تو لوگ تمہیں دیکھنے لگے ہیں بس دو ہی باتیں ہیں صرف دو۔ باقی سب بیچ ہے۔ سب بیچ! یا تو تم میں خود دیکھنے کی الہیت ہو یا دوسروں کی توجہ جذب کرنے کی۔ اور تم نے ثابت کر دیا

ہے کہ تم دونوں خصوصیات رکھتے ہو۔“

ایلی گھبرا گیا۔ ”نہ جانے کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ میں نہیں سمجھا۔“

”سب کچھ سمجھ میں آجائے گا۔“ شریف ہنسنے لگا۔ ”بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ آج تم سے مل کر بڑی راحت ہو رہی ہے مجھے۔ تمہاری قسم بڑی راحت۔“

شریف سے ملنے کے بعد جب وہ احاطے میں پہنچا تو اسے ارجمند مل گیا اسے دیکھتے ہی ارجمند چلایا۔ ایلی۔ تم ہی تیلی کے تیلی رہے ہاں ہمارا سارا منکر اینڈی تم نے تباہ کر دیا بھائی۔ وہ عجیب آدمی ہو۔ اتنا ترین کیا تھا۔ میں۔ سب اکارت گیا۔ سناء ہے محبت لگا بیٹھنے ہو۔ اربے بے وظف محبت لگانا مردوں کا کام نہیں۔ مردوں کا کام تو پھول پھول بیٹھ کر لطف اندو زہونا ہے اور ہم لوگوں کی دوستی ملاحظہ ہو یا رجب سے شاہ کا کوئی فیکٹری میں ملازم ہوا ہوں ہر ساعت یہی خیال رہا ہے کہ گاؤں کی گوریاں چن چن کے پھضار کھوں۔ اپنے لیے نہیں۔ تمہاری قسم۔ بلکہ اس خیال سے کہ یار لوگوں کو بلا کر کبھی عیش کر اداوں۔ وہ محفل جماوں کے سالے عمر بھر یا در کھیں۔ مگر یار ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا تم نے یہ عشق کی یہاری لگا کر۔ آخر تیلی ہی ہے نا وہ کہتے ہیں نا کہتے کی دم کو میں سال لو ہے کی نالی میں رکھو پر نکالو گے جب تو سالی ٹیزی ہی نکلے گی۔“

چھ بھائی

ارجمند کو شاہ کا کوئی فیکٹری میں نہ کری کرتے صرف چھ ماہ کا عرصہ ہوا تھا اس قلیل عرصے میں وہ بہت بدل چکا تھا۔ اول تو اس کا قدر بہت لمبا ہو چکا تھا۔ ارجمند کے تمام بھائی دراز قد تھے۔ محلے میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو قد میں ان کی برابری کر سکتا ہو۔ ان بھائیوں میں تین عجیب خصوصیات تھیں ایک تو وہ سب غیر معمولی طور پر دراز قد تھے۔ دوسرے تمام کے تمام بھائی خوش مزاج تھے اور سنجیدہ سے سنجیدہ بات کو مذاق میں نال دیا کرتے تھے اور بڑی سے بڑی مصیبت کو نہیں کے برداشت کرنے

کے عادی تھے۔

ان کے والد ڈاکٹر تھے۔ والد کے زیر سایہ انہوں نے بڑی ناز و نعمت سے بچپن گزارا تھا لیکن والد کی وفات کے بعد مالی مشکلات کا دور آیا۔ وہ گھر میں چھپ کر چلنی سے روئی کھاتے اور پھر باہر نکل کر یوں ہو چکیں سنوارا کرتے جیسے کوئتے کھا کر آئے ہوں۔ لیکن ان کی تیری خصوصیت بہت ام انجینیئر تھی۔ بچپن گزر جانے پر وہ دفلتا اونچے لہجے جوان بن جاتے تھے۔ یہاں تک کہ عام دروازوں سے گز رہنا بھی ان کے پی مشکل ہو جاتا لیکن جوانی پنے ساتھ ہی پیغامِ اجل لے آتی جوان ہوتے ہی وہ یا تو نبی کاشکار ہو جاتے یا سی اور مجھ سے آنانکا نام مر جاتے۔ باپ کی وفات کے بعد ارجمند کا بڑا بھائی بھر پور جوان میں فوت ہو چکا تھا۔ اس کی وفات پر ان کے گھرانے کی حالت اور بھی نازک ہو گئی تھی۔ اب ارجمند جوان ہو رہا تھا ارجمند کی بوڑھی ماں جو مصائب کی وجہ سے جیتے ہی گویا پاگل ہو چکی تھی ارجمند کی جوانی دیکھ کر اپنے دل میں فخر محسوس کرتی مگر دفلتا نہ جانے اسے کیا خیال آتا کہ وہ مسرت بھری نگاہ حسرت میں بدل جاتی۔ اس کی آنکھیں بھر آتیں اور وہ منہ موز کر آنسو پوچھتی۔ اس پر ارجمند قہقہہ مار کر ہستا اور کہتا۔ ”اماں رو رہی ہوتم۔ وہ اماں رونے کی اس میں کوئی بات ہے۔ مابدولت اب بڑے ہو گئے ہیں۔ اب گھبرا نے کی کوئی بات نہیں۔ سمجھو اب سکھ چین کا زمانہ آ گیا۔ چلنی کی جگہ مابدولت کے حکم سے چانپیں اور کوئتے ہوں گے اور سوکھی روئی کی جگہ پڑاٹھے۔“ وہ جھک کر ماں کو آغوش میں لے لیتا۔ ”اب تو کوئی رونے کی بات نہیں اماں۔“ وہ ہستا۔ ”نہیں اماں ہم مریں گے نہیں۔ اللہ میاں نے جو تیسویں پارے میں صاف لکھا ہے کہ ارجمند نہیں مرے گا جب تک اس کے یہاں بارہ لڑکے اور چھٹاٹکیاں پیدا نہ ہو جائیں گی اور اس کی داڑھی دو فٹ گیا رہ اونچ تک نہ بڑھ جائے گی۔ واہ تم ویسے ہی روئی ہو اماں۔“

ان کی جوان مرگی کے متعلق تمام محلے میں چرچا تھا۔ لوگ محسوس کرتے تھے کہ ان کی جوانی پیغام اجل لاتی ہے حالانکہ اب تک صرف ایک بھائی ہی فوت ہوا تھا اور پانچ بھائی بھپن کے مختلف مدارج طے کر رہے تھے۔

سچا عاشق

نوکر ہونے کے بعد ارجمند نے اعلانیہ طور پر احاطے میں کھڑے ہو کر انگرایندھی کے شغل میں مصروف رہنے کی عادت چھوڑ دی تھی۔ وہ احاطے میں کھڑا ہوتا تو تھا مگر اس کے انداز میں ایک وقار سا پیدا ہو گیا تھا اگرچہ اس کے جذبات وہی پرانے تھے اور اس کا طریق کار بھی نہ بدلتا تھا۔

لیکن ایلی کے لیے اس شغل میں حصہ لینا ممکن نہ رہا تھا۔ وہ کیسے احاطے میں کھڑا ہو سکتا تھا۔ اسے بار بار یہ خیال آتا تھا کہ محبت لگانے کے بعد اس کا لڑکیوں کو دیکھنا مناسب نہیں۔ لوگ سمجھیں گے کہ اس کا عشق محض ایک ڈھونگ ہے۔ جسمانی لذت کے حصول کا ذریعہ... اور پھر نہ کر کہیں گے کیوں نہ ہو آخربیٹا کس کا ہے۔

ایلی کو جس قدر نفرت اس ایک جملے سے تھی کسی اور چیز سے نہ تھی۔ اسے خود علی احمد کے طریقہ کار سے نفرت تھی شاید اس لیے کہ ان کی اس خصوصیت کی وجہ سے اسے بہت دکھ سہنا پڑا تھا۔ اس کی ماں کی زندگی تباہ ہوئی تھی۔ ان کا گھر بر بادر رہا تھا پھر وہ اس انداز کو کیسے اچھا سمجھ سکتا تھا اس لیے اس نے اس طریق کار سے پہلو بچانے کے لیے ول میں یہ ایمان پیدا کر لیا تھا کہ محبت کو جسم سے کوئی تعلق نہیں بلکہ محبت اور جسم دو مترادفاتیں ہیں۔ وقت کثی کے لیے لڑکیوں کو دیکھنا اس کی نظر میں جرم تھا۔ ول گلی کے لیے انگرایندھی کا کھیل کھیانا اسے گوارانہ تھا اور اب جب محلہ بھر میں اس کے عشق کے چرچے ہو رہے تھے۔ اب تو اس کے لیے احاطے میں کھڑا ہونا ممکن ہی نہ رہا تھا۔ سچے عاشق کا کام یہ نہیں کہ چوگان میں کھڑے ہو کر نوجوان لڑکیوں سے آنکھیں لڑائے۔ اس کے رکھ سچے عاشق کو تو چاہیے کہ چار پائی پر

لیٹ کر مسٹنگا ہوں سے چھت کی طرف گھورتا رہے اور جب تھک جائے تو ٹھنڈی آہ بھر کر پہلو بدال لے۔

طوفان بدتمیزی

اس رات بستر پر لیٹئے ہوئے جب وہ نیم کی سرگوشیوں کے متعلق سوچ رہا تھا تو اس نے پاؤں کی بلکی سی آہ بھٹ سنی جیسے نیم بیٹھیاں اترانے کرتی تھی۔ وہ انھے بیٹھا۔ تصور میں کتنی قوت تھی کیسی وضاحت سے آواز آرہی تھی پھر آہستہ سے دروازہ کھلا جیسے نیم کھولا کرتی تھی۔ ”مجھے بائیکل کی سیر کرو۔“

ایک اوپری لمبی نیم کو سامنے دلکھ کروہ گھبرا گیا۔

شہزادہ پڑی ”ڈر گئے۔“
”اوہ آپ ہیں خالہ جی۔“ ایلی اسے خالہ کہا کرتا تھا۔

”ابھی سے سو گئے۔“ وہ پھولدار پروں کو سمیتے ہوئے بولی۔

بیٹھ جاؤ خالہ جی۔ کہہ کروہ گھبرا گیا۔ اسے بٹھانے کہاں۔ کمرے میں ایک چارپائی کے سوابیٹھنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔

”کہاں بٹھاؤ گے۔“ شہزادہ پڑی۔

ایلی ٹھنڈا شہزادوں کی بات کس طرح بھانپ لیتی تھی کیا وہ اس کے دل کی سب باتوں کو سمجھتی تھی۔ اس خیال پر وہ لرز گیا کیونکہ اپنے دل کی سب باتوں کو اپنا نے یا ان پر سوچنے کی اسے کبھی جرات نہ ہوئی تھی۔ کئی بار اپنی کسی پوشیدہ خواہش کی بلکی سی جھلک دلکھ کروہ گھبرا جایا کرتا تھا اور پھر دوسرے امور پر غور کرنے کی کوشش کرتا اس وقت بھی اسے بٹھانے کے متعلق نہ جانے کیا خیال آیا تھا۔ اس کے دل میں اکثر شہزادو کو دلکھ کر طوفان سا پیدا ہو جاتا تھا۔ ایک عجیب ساطوفان بدتمیزی۔

ایک طرف موگیا گٹھڑی کے پٹ کھل جاتے۔ دوسری طرف نیلی جھیل میں کنول سا ابھرتا۔ مینڈک ملہار گانے لگتا ادھر دو سفید سے بازو لہراتے ادھر دو نگین

خونیں ہاتھ اس کی طرف لپکتے اور کہیں سے شریف کی تعبسم آواز سنائی دیتی۔ ”ہر کوئی اپنی نگاہ سے دیکھا ہے پلگی۔“ اور پھر وہ اس طوفان بد تیزی کو سمینے کی شدید کوشش کرتا۔

اس طوفان بد تیزی پر اپنے شدید غصہ آتا تھا۔ اپنے آپ پر غصہ آتا۔ وہ محسوس کرتا تھا جیسے علیٰ احمد بنا جا رہا ہو۔ پھر اس کا جی چاہتا کہ بھاگ کر روپوش ہو جائے۔ ”کہاں بٹھاؤ گے۔“ اسے خاموش دیکھ کر شہزادے اپنی بات دہرائی۔ ”اے نہ بٹھا سکتا مجھے کیسے بٹھاؤ گے؟“ وہ پھر نہیں۔ اس کی بُنیٰ شرارت آئیز تھی۔

نہ جانے شہزادے اس قسم کی لڑکی تھی۔ ایک انوکھی عجیب سی لڑکی۔ جس کی ہر بات زرالی تھی۔ جس کی ہر حرکت گویا منہ ہوم سے بھری ہوئی تھی۔ نہ جانے شہزادے کی ہر بات چھیڑ کیوں دیتی تھی۔ اس کی ہر نگاہ دل میں کھب کیوں جاتی تھی۔ اور یہی نہیں اس کا طرز عمل دو دھاری تھا۔ وہ ایک نگاہ سے یوں چھیڑتی جیسے اسے چھیڑ دینے سے دچپی ہو اور دوسری نگاہ سے یوں الگ تھلک ہو جاتی جیسے ان باتوں سے بلند تر ہو۔ جیسے اسے فانی مخلوق سے قطعی طور پر کوئی دچپی نہ ہو۔ ایک ساعت میں وہ اس قدر قریب آ جاتی تھی جیسے پوچھ رہی ہو۔ ”میں کہاں میں ہوں۔“ اور دوسری ساعت میں اس قدر آ جاتی۔ دور..... اس افق سے بھی دور جہاں گلابی جھیلوں میں فیلے مینڈک پھد کتے تھے۔ ایک وقت اس کا تعبسم گویا دل کو کاٹ کر رکھ دیتا اور پھر دوسری ساعت میں اس کے ہونٹوں میں ایک ہلکی سی سلوٹ پیدا ہو جاتی اور محسوس ہوتا جیسے وہ مذاق اڑا رہی ہو۔ تفحیک کر رہی ہو۔ رنگینی کے باوجود اس میں بے نیازی کا غصر بہت واضح تھا۔ ایلی اسے بلند و بالا ہستی سمجھتا تھا جس کے متعلق ایسی ویسی بات نہیں سوچی جاسکتی تھی۔ لیکن یہ کیا مصیبت تھی کہ ایسی ویسی بات نہ جانے کہاں سے اس کے دل میں آ گھستی اور وہ شرمندہ ہو کر کسی اور بات کے متعلق سوچنے کی شدید کوشش کرتا۔

لیکن اس روز تو شہزاد کا انداز قطعی طور پر مختلف تھا اور اس کا رات کے وقت وہاں
اکیلے آنا۔ اور پھر پوچھنا۔ ”کہاں بٹھاؤ گے۔“

وہ چارپائی کے ایک کونے پر بیٹھ گئی۔ ”ایلی۔“ وہ بولی۔ ”میں پوچھنے آئی ہوں
کہ کیا واقعی تمہیں محبت ہو گئی ہے۔“ ایلی گھبرا گیا۔ وہ اسے کیا جواب دے۔

”اس خبر کی تو محلے میں دھوم پھی ہے آج کل پھر تم مجھ سے گیوں چھپاتے ہو۔“
”چھپا تا تو نہیں۔“ ایلی نے بمشکل کہا۔
”تو بتاؤ نا۔ یہیج ہے کیا؟“

ایلی نے اشیات میں سر ٹلاویا اور چیز رہما۔
”کتنے بد نصیب ہو تم ایلی۔“ شہزادی آواز میں سمجھی گئی تھی۔ ”بہت بد نصیب ہو
تم۔“ وہ بولی۔ ”اگر تم کچھ دری صبر کرتے اگر تم جلد بازی نہ کرتے تو کتنا چھا ہوتا۔“
”میں نہیں سمجھا۔“ ایلی نے آہستہ سے کہا۔

وہ مسکرا دی۔ ”اب سمجھنے کا کیا فائدہ۔ اب تو نہ ہی سمجھو تو اچھا ہے۔ جب میں
پہلے پہل یہاں محلے میں آئی اور تمہیں دیکھا تو میں سمجھی کہ ایلی ایک عام سالڑکا ہے۔
مجھے یہ خیال بھی نہ پیدا ہوا تھا کہ تمہیں دیکھ کر کسی کے دل میں اتنا گہرا اثر پیدا ہو سکتا
ہے وہ تو آپے ہی میں نہ رہی۔ لیکن اب کیا فائدہ۔ بے کار ہے اب۔ بیچاری۔“ وہ
آہ بھر کر خاموش ہو گئی۔

ایلی حیران تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔

”خالہ،“ ایلی بولا۔ ”یہ کیا طو طا مینا کی کہانی سن رہی ہیں آپ۔“

”ہاں۔“ وہ مسکرا دی۔ ”میں سمجھتی تھی۔“ وہ بولی۔ ”یہ طو طا معمولی طو طا ہے جیسے
ہوتے ہیں طو طے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ طو طا بولتا بھی ہے۔ اب تو ہمیں طو طے
سے ڈر آنے لگا ہے۔“ وہ پھر بُنسی۔

”جبھی یہاں آگئی ہو اس وقت اکیلی۔“ ایلی نے پہلی مرتبہ شہزادے مذاق کرنے کی جرات کی۔

”اوہ ہوں“ وہ سنجیدگی سے بولی ”میری بات چھوڑو۔ یہ تو مینا کا خیال تھا جو مجھے یہاں لے آیا ہے۔“

”مینا کون ہے؟“ ایلی نے پوچھا۔

”وہ بھی تھی بیچاری۔ نہ جانے اسے کیا ہو گیا۔ اس کی سدھ بددھ جاتی رہی۔ اس نے کہا تھا طے کو مینا کی کہانی سنادیں ایک بار۔ شاید اس کہانی کو سن کر سمجھ جائے مگر بیکار ہے مجھے معلوم نہ تھا کہ طے کا بن بولے باقیں کرتا ہے اور اس کا اثر اس حد تک ہو سکتا ہے تو یہ ہے۔“ شہزادے نے حیر حیرتی کی۔ ”بچھا،“ وہ کھڑی ہو گئی۔ ”میں چلتی ہوں نا حق تمہیں بے آرام کیا۔ صبح آؤ گے نا۔“

”لیکن ذرا اٹھہر و تو۔“ ایلی نے کہا۔

”نہ بھی۔“ وہ فنسی اب تو تم سے ڈرآنے لگا ہے۔“ اور فنسٹی ہوئی چلی گئی۔

ایلی دیر تک بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ طوٹا کون تھا۔ مینا کون تھی اور بے پروا بے نیاز شہزاد کو اب ڈر کیوں آنے لگا تھا۔ ایلی کے دل میں جذبات کی ایک بھیڑ لگی ہوئی تھی۔

ایلی کو یہ معلوم بھی کیسے ہوتا کہ شہزاد گول کے بن کی سانوری کے متعلق بات کر رہی ہے۔ وہ سانوری جسے وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا کرتا تھا اور سمجھتا تھا کہ وہ ایک سہانا خواب ہے ایک دلش تصویر۔ وہ خواب بھلا حقیقت کیسے ہو سکتا تھا۔ حقیقت تو محلے کی لاکیاں تھیں جو چتوں کے پیچھے چھپ چھپ کر مسکراتی تھیں۔ اور پھر اپنے آپ سے ڈر کر پیچھے ہٹ جاتیں۔ لیکن سانوری تو یوں بے نیازی سے کوٹھے پڑھلا کرتی تھی جیسے گرد و پیش ایک ناقابل توجہ منظر پیش کر رہا ہو۔ وہ ایک ساعت کے لیے بھی یہ نہ سوچ سکتا تھا کہ طوٹا مینا کی کہانی کی مینا سانوری تھی جس

نے کبھی آنکھاٹھا کہ اس کی طرف نہ دیکھا تھا جو اسے قابلِ اتفاقات ہی نہ سمجھتی تھی۔ اس زمانے میں ایلی نسائی دوری سے واقف نہ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ عورت بھی اسی طرح ہوتی ہے جیسے لڑکے ہوتے ہیں۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ان کی بظاہر بے نیازی محسوس ایک پر دہ ہوا کرتی ہے۔ اس لیے وہ طو طایینا کی کہانی کے مفہوم کو نہ سمجھ سکا اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ سانوری نے اسے ایسا مرتبہ بخشنہ ہے تو وہ خوشی سے ناچنے لگتا لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ ایک بار بڑنے کی چوٹ سے تسلیم کے عشق کا اعلان کر چکا تھا۔ عشاق تو ایک بار محبت لگا کے پھر نہیں بدلتے۔ پچی محبت کی سب سے بڑی خصوصیت اس کے نزدیک وفا تھی۔ سر دھرمی کے باوجود وفا بے پرواںی کے باوجود وفا۔ اگر اسے طو طایینا کی کہانی کا مفہوم معلوم ہو جاتا تو اسرا وہ شکش میں گرفتار ہو جاتا کہ کس طرح تسلیم کو چھوڑ کر سانوری سے عشق لگائے۔

ایک اور

اگلے روز صبح ہی علی احمد کی آمد کا شور مجھ گیا۔ پچھا امداد جو کسی کام سے شیشیں گھے ہوئے تھے واپسی پر احاطہ میں آ کر چلانے لگے۔ ”بہن نواب۔ بہن نواب۔“ دادی اماں ان کی آواز سن کر بولیں۔ ”اے ہے لڑکی یو سن تو امداد کی آواز آ رہی ہے۔ تم تو کانوں میں تیل ڈال کر بیٹھ رہتی ہو۔“

”بہن نواب سے کہہ دو۔“ پچھا امداد چلانے۔ ”علی احمد آ رہے ہیں میں نے انہیں شیشیں پر دیکھا ہے کھانا وانا تیار رکھے اور سیدہ بیٹی، وہ نہ کر بولے۔“ کہنا ساتھ شیشیں بھی ہے بچے بھی اور ایک اور بھی۔“ وہ ہنسنے لگے۔ ”اے ہے پچھا۔“ ایک بولی۔ ”یہ ایک اور کون ہے۔“

پچھا نہیں۔ ”ہر بار ہوتی ہے ساتھ ایک اور بھی بات ہے کیا۔“ ”کیوں نہ ہو ایک اور ساتھ۔“ دوسری بولی۔ ”علی احمد کے ساتھ ایک اور نہ ہو تو کوئی کیسے جانے کہ علی احمد ہیں۔“

”مگر پچھلی اب کی بارکوں ہے؟“

”ہو گی کوئی ترکھانی یا نہنی۔“

”اے ہے یہ نہ کہو سناء ہے شریف زادیاں بھی آتی ہیں۔“

”نہ بھی میں تو نہیں مانتی۔ وہ شریف زادی ہی کیا ہوئی جو آگئی۔ اور بہن یوں چپکے سے اور اطمینان سے انقلی پکڑے آتا ہے یہ علی احمد۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو جیسے میلے سے مٹی کی گوجردی خرید کر لارہا ہو۔ ذرا نہیں شر مانتا ذرا نہیں سوچتا کہ محلے میں جا رہا ہوں محلے والے کیا کہیں گے۔“

”ہونہہ۔ محلے والے محلے والوں کی بہن اور پرواکرتا ہے کیا جو کچھ پوچھو تو شرافت غریبوں ہی میں رہتی ہے علی احمد کے پاس اللہ کے نفل سے چار پیسے ہیں۔ اچھے عہدے پر لگا ہے۔ اے محلے والوں کی کیا پروا۔“

علی احمد کا قافلہ احاطے میں داخل ہوا تو محلے کے مکانوں کی تمام کھڑکیاں بھری ہوئی تھیں۔ بوڑھیاں چوگان میں کھڑی تھیں اڑکیاں چھوٹوں کے پیچھے دیکی ہوئی تھیں، جیسے علی احمد کی آمد ایک عظیم واقعہ ہو۔

”علی احمد،“ ایک بولی۔ ”سناء ہے پھر ایک اور ساتھ لے آیا ہے۔“

”ہی ہی ہی۔“ علی احمد نے۔ ”چھپی وہ تو شیسم کی سیبیلی ہے۔“

”سہیشہ سیبیلی ہی بن کر آتی ہے پہلے پہل۔“ ایک چلائی۔

”اے ہے علی احمد تیرے بہانے نہ گئے کیسے کیسے بہانے تراشتا ہے تو۔“ دوسروی نے کہا۔

”ہی ہی ہی۔“ وہ نہے ”تو اور کیا صاف صاف کہہ دوں تمہارا لاحاظہ بھی نہ کروں چاچا۔“

”اے ہے۔ یہ اچھا لاحاظہ ہے علی احمد۔“ وہ قہقہہ مار کر ہٹنے لگی۔

علی احمد ہی ہی کرتے ہوئے ڈیورٹھی میں داخل ہو گئے اور محلے والیوں کی

نگاہیں ان کے پیچھے چلتے ہوئے قافلے پر مرکوز ہو گئیں۔
”چھپی ہے تو اونچی لمبی۔“ آیک بولی۔

”ہو گی تو ویسی ہی کالی کلوٹی۔ ایسی ہی لایا کرتا ہے۔ یہ علی احمد۔“ دوسری نے کہا۔

”نه جانے کیا چاہو ہے اس کو۔ گلی سڑی اٹھاتا تھا ہے۔“ تیری سے منہ بنا کر کہا۔

”ہائے ری۔“ آیک چلائی میں مر گئی یہ تو غنی معلوم ہوتی ہے۔

”دنی ہے تو اور بھی اچھا ہے اپنے علی احمد کو ناج نچائے گی۔“

”اے یہی تو وہ چاہتا ہے۔“ چھپی نے جواب دیا۔

”اتنی عمر بیت گئی پہا بھی یہ جنون اس کے سر سے نہ گیا۔“

”وہ جنون ہی کیا ہوا ماس جو چلا جائے۔“

داوی اماں نے اپنے کمرے سے آنکھ بچا کر دیکھا پھر دھرم سے تخت پر گر پڑی۔ جیسے اسے دھکا لگا ہو۔ پھر بات کیے بغیر تخت پوش پر گذشت ہو کر پڑی رہی جیسے سجدہ میں پڑی ہو۔

شیم نے گھر میں داخل ہوتے ہی بر قعہ اتار کر پھینک دیا اور تیزی سے بھاگ کر اپنے کمرے میں داخل ہو گئی۔ اس کا منہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا آنکھیں رو رو کر ابلی ہوئی تھیں۔ اس کی دونوں لڑکیاں کہی ہوئی تھیں۔

مغدرت

علی احمد اور نووار دوہ چپ چاپ اطمینان سے الگ ایک کمرے میں جا بیٹھے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو باہر محلے والیوں کا تھمگھٹا لگ گیا۔

”ایلی۔“ علی احمد نے آواز دی۔ ”ایلی بھئی یہ راجوت میں ملنے آئی ہے۔ ہی ہی ہی کہتی تھی کہ علی پور دیکھوں گی۔ اب یہ کام تمہارا ہے ایلی کہ اسے گھماو پھراو۔ ایلی تو علی پور کے چپے چپے سے واقف ہوانا۔ ہی ہی ہی۔ کیوں ایلی۔ اچھا تو ہا جرہ کہاں

ہے اسے راجو سے ملائیں۔“

”سیدہ۔ کیا کر رہی ہے۔ تو۔ ادھر آنا دھر دیکھی راجو تجھ سے ملنے آئی ہے اور تو وہاں چوہے کے پاس بیٹھی ہے۔ یہ دولت پور کے رہنے والے ہیں۔ راجپوت ہیں۔ اپنی دوکانیں ہیں۔ زمینیں ہیں۔ بھی جانتے ہیں انہیں وہاں دولت پور میں مشہور خاندان کے ہیں۔ راجپوت وہاں عزت والے تجھے جاتے ہیں۔ آ جاؤ۔ آ جاؤ۔ بیٹھ جاؤ۔ سیدہ راجو یہ سیدہ ہے میری بہن کی بیٹی۔ میری بیٹی ہی سمجھو۔ اپنے یہاں ہی رہتی ہے۔ اور کہہ سیدہ کیا حال چال ہے۔ ہاجره ہیں آئی۔ وہ شیم کیا ہوئی۔ سفر کی وجہ سے تحکم کر جائی ہو گی اپنے کمرے میں ہی ہی۔ اچھا بھائی سیدہ ذرا چلم میں دوکوٹ کے دینا۔ واقعی سفر میں انسان تحکم جاتا ہے۔“

وہ مسلسل بولتے گئے جیسے خاموشی سے ڈرتے ہوں جیسے آواز کے تنگے کا سہارا لے کر ڈوبنے سے بچنا چاہتے ہوں اور پھر ہر بات پر ان کا تفہیم گوختار ہا کھوکھلا کھیانہ تفہیم جیسے وہ راجو کو لانے پر معذرت کر رہے ہوں۔

”اماں۔“ وہ بھاگے بھاگے اپنی والدہ کی طرف آئے۔ ”اماں تمہارا کیا حال ہے؟“ ”اچھی بھلی ہوں علی احمد۔“ بڑھیا نے جواب دیا۔ ”ذرادم کی تکلیف ہے۔ رک جاتا ہے۔“

”پھر تو بہت تکلیف ہوئی۔“

”اب یہی کچھ ہونا ہے نا۔ کچھ وقت بیت گیا کچھ بیت جائے گا مگر علی احمد یہ تو کیا لے آیا ہے۔“ داوی اماں نے آہستہ سے کہا۔

”اوہ اماں۔“ وہ بنتے ”بہت دلی ہو گئی ہو۔ کوئی دوا دار و کر رہی ہو۔“ علی احمد کو یوں بات بدلتے دیکھ کروہ مسکرا کر بولی۔ ”علی احمد تیری عادت نہ بد لی اور دوا کا کیا پوچھتے ہو۔ اب تو دعا کرو۔“

”نہیں نہیں۔“ وہ بولے۔ ”میں ڈاکٹر کو بلاوں گا اس سے پوچھوں گا۔“ اور پھر

راجو کے پاس یوں جا بیٹھے جیسے وہ خود مریض ہوں اور ڈاکٹر ان کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی اور پھر علی احمد کے کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔

گرو دیو مہاراج

راجو کے آنے پر چار لاکھ دن محلے میں یہی شغل رہا ایک مسکرا کر پوچھتی۔ ”علی احمد یہ تو کیا لے آیا ہے۔“

علی احمد مسکرا کر جواب دیتے۔ ”چھپی یہی تو مجھے تم سے پوچھنا ہے یہ میں کیا لایا ہوں۔ خسارہ کا سورا تو نہیں۔“

دوسری پوچھتی۔ ”علی احمد یہ کیا لے آیا تو دیکھنے میں تو پچھو بھی نہیں۔“

علی احمد نہ سکر سکتے۔ ”ہاں بہن دیکھنے میں پچھو بھی نہیں۔“

پھر کوئی محلے والا چلاتا۔ ”علی احمد اب تمہارے دن نہیں رہے۔“

”ہاں بھی صاحب۔“ وہ ہستے۔ ”بھجی تو راتیں منارہا ہوں۔“

ایلی بھی راجو کو دیکھ کر حیران تھا اس میں وہ بات ہی نہ تھی۔ کوئی بھی تو بات نہ تھی اس میں۔ بالکل چلا ہوا پٹا خندہ جانے کیا ہو گیا تھا اسے۔ جیسے کچھ ہو گیا ہو۔

اگلے روز جب ایلی نے ارجمند سے بات کی تو وہ قہقہہ مار کر ہٹنے لگا۔ ”بھی واہ ایلی تم تیلی کے تیلی ہی رہے صرف علی احمد ہی سیانے آدمی ہیں باقی تو سب الو کے پڑھ رہتے ہیں۔ یہاں وہ ہاتھی کے دانت نہیں پالتے جو کھانے کے نہیں بلکہ وکھانے کے ہوں سمجھے میاں۔ پیٹ کی بھوک آنکھیں سیراب کرنے سے نہیں مٹتی سمجھے مگر تم کیا سمجھو گے۔ تم تو ہوئے تیلی کے تیلی۔ مطلب یہ ہے پیٹا وہ کہا ہے سیانوں نے کہ عورت دیکھنے کے لیے نہیں لائی جاتی گھر میں۔ پھر صورت پر کیا جانا۔ تمہارے ابا تو گرو دیو مہاراج ہیں۔ وہن ہیں گرو دیو مہاراج وہ انگریزی سیکھ رکھا ہے کہ واہ وا۔ یوں اڑی چلی آتی ہیں جیسے شمع پر پروانہ آتا ہے۔ آہا کیا گر سیکھ رکھا ہے تمہارے ابا نے پیٹا اپنے ابا کی قدر و منزلت اس خاکسار سے پوچھو۔ اپنے خادم سے پوچھو۔

خاکسار پر اناکھلاڑی ہے۔ خاکسار نے یہ کھیل ڈپنسری کی میزوں پر سیکھا تھا اور آج
اسنے سال کے بعد جب خاکسار شاہ کا گوگیا اور جناب یوں سمجھ لو کہ ایک طرف شاہ
گاؤں ہے اور دوسری طرف کا گاؤں اور درمیان میں بروزے کی فیکشی ہے
جہاں خاکسار سور کیپر ہے۔ ادھر سے شاہ کی شہزادیاں آتی ہیں اور ادھر سے کا کو کی
کرا ریاں۔ خاکسار ایک نظر ادھر رکھتا ہے۔ دوسری ادھر۔ اس قدر چاق و چوبنڈ
رہنے کے باوجود نیچجے کیا ہے۔ بالکل فیل۔ چھ ماہ میں صرف دو چھٹی تھیں اور وہ بھی
سمجھ لو مجبوری ہے۔ لیکن تمہارے ابا۔ سبحان اللہ اکرو دیو جی مہاراج وہ انگرایندی
چلاتا ہے بڑھا کہ دو لوت پورے علی پور چلی آتی ہیں۔ واہ واہ۔ بیٹا بڑے ہو کر فخر کیا
کرو گے اس بڑھے کے کارناموں پر۔ مکریارائیں سے وہ نسخہ تو لے لو جو وہ استعمال
کرتا ہے۔ بیٹا ہمارا یہ کام کرو گے تو سدا بھی رہو گے۔

اے تو محلے کے سبھی لوگ اس بارے میں ایلی سے کچھ نہ کچھ کہنے کے لیے بے
تاب ہو رہے تھے۔

ایک کہتا۔ ”میاں ایلی مبارک ہو۔“

دوسرا کہتا۔ ”کہونی مال پسند آئی۔“

تیسرا کہتا۔ ”کیوں ایلی تم کب تک دیکھتے رہو گے میاں اب تو تمہارے دن آ
گئے۔“

کوئی کہتی۔ ”اے ایلی تیرے ابا کا چناؤ کیسا ہے۔“

ایک بولتی۔ ”اے ایلی تو ناس راہ پر چلیو۔ چھوڑ اس کو۔ اس نے تو اپنی جندگی تباہ کر
لی۔“

پھر اتفاق سے محلے میں دو ایک شادیوں کا اہتمام شروع ہو گیا اور لوگوں کی توجہ
علیٰ احمد اور راجو سے ہٹ کر شادیوں کی طرف مبذول ہو گئی۔

----- اختتام ----- حصہ اول -----